جائیں اور پھر دیہاتی ہل، بیل کے ذریعہ محنت کش کسان اس کو تہ وبالا کردے۔ گھاس اور زہر آلود کانٹے اس خاک شدہ کھوپڑی کو اپنا گھر سمجھ کر اس میں پروان چڑھنے لگیں۔ ایک طرف تماشا بینوں کے لئے رقت بار منظر اور دوسری طرف کیڑے مکوڑوں کو ایک سر ڈھانپنے کی جگہ اور ایک تفریح گاہ مل جائے اور آخر کار فیروزی رنگ کا اقیانوس کبھی کبھی رات کے وقت ایک خاص ہمدردی و دلسوزی کے چند قطرہ ہائے اشک اس کے کاسۂ سر پر نچھاور کرے کہ شاید اس طرح اس کے ہزاروں سال پرانے شعلے خاموش ہو جائیں۔

زندگی کے اس متوالے کی تاریخ یہیں ختم نہیں ہو جاتی چونکہ وہ کسان اپنے چھوٹے سے کھیت کے لئے کسی مفت کے پاسبان کی جستجو میں رہتا ہے۔ اس لئے اس کھوپڑی کو نہایت بے رحمی سے خالی کر دیتا ہے اور ایک خشک لکڑی اس کے آنکھ، کان یا ناک میں ڈال دیتا ہے اور اسے آتش گرداں کی طرح ہلاتا اور گھماتا ہوا اپنے کھیت میں مفت کے پاسباں کے عنوان سے نصب کر دیتا ہے۔ اب وہ وقت ہے جب اس حوادث سے پر کاسۂ سر کو دو کام انجام دینے ہیں: ایک یہ کہ کھیت کی نگہبانی کرے دوسرے یہ کہ اس کھلی اور وسیع فضا کا تماشا کرے جو نہ جانے کب سے ستاروں کے ساتھ حوادث روزگار کی شاہد رہی ہے۔

یہ ہے اس سفر کا منظر جس کیلئے ہر ایک کو رخت سفر باندھنا ہے۔ ہوا سے باتیں کرنے والا وقت کا گھوڑا جوانان سبز خط سے لے کر ان لوگوں تک جنکی پشت، سنگین بار کے سبب سالوں سال خمیدہ رہی ہے، سادہ لوحوں سے لیکر صاحبان نظر تک، ناتوانوں سے لے کر طاقتوروں تک اور عام انسانوں سے لے کر فلسفیوں، دانشمندوں حتی انبیاء تک، ہر ایک کو اپنے اوپر سوار کر کے زمین کے اندر کی جاودانی قیامگاہ تک پہونچائے گا۔

بریافت کے بقول ان کی باری بھی آئے گی جنھوں نے ابھی اس دنیا کو دیکھنے کے لئے آنکھیں بھی نہیں کھولی ہیں۔

اگر بنی آدم کو یقین ہوتا کہ ان کا سرانجام اور ان کی سرنوشت یہیں پر ختم ہو جاتی ہے تب پریشانی کی بات نہ تھی چونکہ ہر ایک کو یہ مناظر مستقبل میں دیکھنا ہی ہیں۔

یدفن بعضنا بعضا فیمشی او اخرنا علی ہام الاوال

(ہم میں سے کچھ لوگ آپس میں دوسرے کچھ لوگوں کو خاک کے سپرد کرتے ہیں اور ہماری آنے والی

نسل ہمارے تن بدن اور ہمارے کاسہ ہائے سر پر زندگی گزارے گی)

از تن چو بر فت جان پاك من وتو خشتے دو نهند بر مغاك من وتو

وآنگاه برائے خشت گورد گران در كالبدے كشند خاك من وتو!

اس سب کے باوجود سوالوں کے سامنے پھر بھی آدمی گھٹنے ٹیک دیتا ہے اور اظہار عاجزی کرنے لگتا ہے۔

ایک یہ کہ دنیائے بعد از مرگ کے منکرین کی ہزاروں تسلی وتشفی کے باوجود آدمی زندگی کے تانے بانے ٹوٹنے سے کیوں گھبراتا ہے اور کیوں ڈرتا ہے؟

دوسرے یہ کہ آپکو کس دلیل نے اس بات تک پہنچایا ہے کہ آپ جنین کے حالات اور موت کی ہولنا کیوں کے درمیان محدود ہیں؟

اگر ایسی کوئی دلیل تھی تو پوری انسانیت کے سامنے کیوں نہیں پیش کی تا کہ آپ کی طرح دوسرے لوگ بھی آسودہ خاطر ہوتے اور اپنے سرانجام کے بارے میں کوئی وسوسہ نہ رکھتے۔

کتنا اچھا ہوتا کہ جب کچھ متفکرین وقتی تسلی کے ذریعہ اور وہ بھی صرف فلسفی بحث وگفتگو کے وقت لوگوں کو موت کی ہولنا کیوں اور بعد از مرگ کے حادثات کے سلسلے میں سوچنے سے روک رہے تھے، کاش اسی وقت اپنے آپ کو سنبھالتے، وقت کے ساتھ سوچتے اور عاقلانہ مفید راہ کو بنی آدم کے لئے ہموار کرتے!

موت
علیؑ کی نگاہ میں

ان تمہیدات کے بعد یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ علیؑ کی عاقبت اندیش نگاہ میں موت و زندگی کیسے برابر ہے؟ بلکہ اگر ہم علیؑ کے مفہوم زندگی میں تھوڑا سا غور و فکر کریں تو شاید اسکی موت کو ''خوش آمدید'' کہنے کی لذت کو پالیں؟

اب آیئے شہنشاہ موت و زندگی کے حیرت انگیز اقوال کا مطالعہ کرتے ہیں:

۱۔ خدا کی قسم! مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے، چاہے میں موت کی طرف چلا جاؤں یا موت میری طرف آجائے۔

۲۔ خدائے یگانہ کی قسم! موت نے کوئی نئی ناگوار چیز میرے سامنے پیش نہیں کی ہے۔

۳۔ خدائے بزرگ و برتر کی قسم! طفل شیر خوار کے پستان مادر سے مانوس ہونے سے کہیں زیادہ علیؑ موت سے مانوس ہے۔

۴۔ جب جانکاہ زخم کے سبب اس کا رشتۂ زندگی ٹوٹ رہا تھا تو فرمایا: رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا۔

فرمایا ہے کہ مجھے کوئی پروا نہیں ہے میں موت کی طرف چلا جاؤں یا موت میری طرف آ جائے۔

ہاں! واقعاً ایک کاغذ جو بے اختیار ایک ماہر مصوّر کے سامنے آ گیا ہو، اس کے لئے کیا فرق پڑتا ہے کہ قلم کو اس کی طرف لے جایا جائے یا اس کو قلم کی طرف۔

وہ پیشوایان توحید کے مکمل نمونے جنھوں نے مصور موت و حیات کے سامنے اپنے آپ کو بے اختیار قرطاس کے مانند تسلیم محض کر دیا ہے، ان کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ قلم مرگ ان کی طرف آ جائے یا وہ قلم مرگ کی طرف چلے جائیں۔ ہاں! یقیناً علیؑ موت کی ہولناکیوں اور بعد از مرگ کے حوادث سے بالکل ہراساں نہیں ہیں۔

آپکا قول ہے کہ موت نے مجھے کوئی نئی چیز پیش نہیں کی۔

البتہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ جس کے لئے حقیقت زندگی کے اوصاف و تشخصات واضح ہو چکے ہیں اور کوئی نقطۂ مجہول باقی نہیں رہا ہے، اس کے لئے موت کونسی نئی چیز لا سکتی ہے؟

ایک عام قانون جس کی ہر بشری تحقیق میں تصدیق ہو چکی ہے اس طرح ہے کہ دو متقابل حقیقتوں میں سے ایک کی شناخت کے بعد دوسری کو بھی پہچانا جا سکتا ہے بلکہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ کسی ایک کی معرفت کو درجۂ تکمیل تک پہنچائیں تو دوسری حقیقت کی مکمل شناخت ضروری ہے۔

اگر توجہ کے ساتھ نیز کسی اور غرض سے ہٹ کر علی علیہ السلام کی زندگی کو دیکھا جائے تو خود انکی زندگی اسکے دعوے کے اوپر دلیل ہے۔

علی علیہ السلام کی زندگی میں خلافت سے پہلے اور خلافت کے بعد بلکہ صدیوں تک انسان نما جانور اور حکومت پرست حیوان اپنے عیوب و نقائص کو چھپانے کے لئے اس کے کردار میں عیب و نقص تلاش کرتے رہے لیکن کبھی بھی یہ ثابت نہ کر پائے کہ اس نے فلاں انفرادی یا اجتماعی موقع پر اپنے ہوائے نفس کی پیروی کی یا کم از کم فلاں کام غلط کیا!

اس سراپا تجسس دنیا میں کون ہے جو ایسے باعظمت منصب کا مستحق ہو! کیا کوئی کہہ سکتا ہے کے علی علیہ السلام

نے زندگی کو نہیں سمجھا تھا!

ہاں! انھوں نے زندگی کو سمجھا تھا کہ موت سے ذرہ برابر ہراساں نہیں تھے۔

اس حقیقت کو اپنے حواس وادراکات کے مطابق دوسری طرح بھی بیان کیا جاسکتا ہے:

وہ شخص جو مست افراد کے درمیان اپنے حواس پر قابض ہے، جو خود غرضوں اور خود پرستوں کے درمیان اجتماع اور سماج کے لئے فکر مند ہے، جو شخص جانتا ہے کہ ہر آدمی کا تشخص اور اسکا حق، اس کے کام اور اسکے عمل سے وابستہ ہے، وہ انسان جو ایسے معاشرے میں جی رہا ہے جہاں زندگی کے تنازعے اور کمزوروں کے حقوق کی پامالی میں انسانیت کے اصول واولیات کو درہم برہم کردیا ہے، کیا ایسا انسان ایسے نفرت انگیز معاشرے میں دن رات موت کا احساس نہیں کریگا؟ اسی لئے علی علیہ السلام موت کی حولنا کیوں اور بعد از مرگ کے حوادث سے کوئی ہراس نہیں رکھتے۔

اس کے بعد فرمایا ہے: ''طفل شیر خوار جتنا پستان مادر سے مانوس ہوتا ہے فرزند ابوطالب موت سے اس سے کہیں زیادہ مانوس ہے۔''

بہت کم دعوے ایسے ہوتے ہیں جہاں اس دعوے کی طرح، دعوے کے ساتھ ہی دلیل بھی ہوتی ہے بلکہ ایک دلچسپ بیان کے ساتھ دلیل خود دعوے سے پہلے سامع کے ذہن میں بیٹھ جاتی ہے۔ تاریخ انسانیت ہزاروں جھوٹے مجسمے بنا کر انسانیت کے حوالے کرچکی ہے لیکن ہزاروں حق سوزی اور لاکھوں ظلم کے باوجود ابھی تک ابراہیم کے فرزند کی خدائے پاک سے دوستی کا انکار نہیں کرسکی۔

چودہ سو سال سے تاریخ یہ اعلان کررہی ہے کہ علیؑ نے خدا سے دوستی کے دعوے میں کوئی بات عبث نہیں کہی ہے۔

چاہو تو ایک ہاتھ میں اس دعوے کو اور دوسرے ہاتھ میں اس کی روشن تاریخ زندگی کو لے کر ایک دوسرے پر منطبق کرکے دیکھ سکتے ہو۔

جب علیؑ دوست خدا ہے تو شب وروز اس سے ملاقات اور اس کے حضور پہنچنے کی تمنا کیسے نہیں رکھے گا؟

آسمانی کتاب سے پوچھو تو وہ بھی یہی کہے گی کہ حقیقی دوست وہی ہے جو دوست سے ملاقات کا آرزومند ہو۔

قل یاایها الذین هادوا ان زعمتم انکم اولیاء لله من دون الناس فتمنوا الموت ان کنتم صادقین

(یہودیوں سے کہدو کہ اگر تمہارا یہ دعوا ہے کہ صرف تم خدا کے دوست ہو تو موت کی آرزو کرو اگر تم سچے ہو۔)

بچے کے لئے پستان مادر کے مقابل علی علیہ السلام کو موت زیادہ شیریں کیوں نہ لگے؟ وہ جنین کے شکم مادر کے عاشق ہونے کی طرح تکلیفوں سے بھری ہوئی زندگی کا عاشق نہیں ہے۔

اس نے اپنی سالم عقل اور پاک فطرت کے ذریعہ درک کر لیا تھا کہ موت کے بعد ابدیت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

موت یعنی مادہ کی تاریکیوں سے چھٹکارا، ہاں! واقعاً جس کسان نے اپنے کھیت میں تخم ریزی کی ہو اور اسکی دیکھ بھال میں طرح طرح کی پریشانیاں جھیلی ہوں اور کسی طرح کی کوتاہی نہ کی ہو، ایسا کسان فصل کے کٹنے کے انتظار میں کیوں نہ بیٹھے اور اپنے سامنے اناج کے انبار کے تصور سے خوش کیوں نہ ہو؟!

کیاانسانی زندگی تخم ریزی کے مانند نہیں ہے؟

کیاموت کا وقت، فصل کاٹنے کا وقت نہیں ہے؟

ہاں! موت کی پریشانیوں اور بعد از مرگ کے حوادث سے نہ گھبرانا علی علیہ السلام کا حق ہے۔

آخر زخم موت لگنے کے وقت علیؑ مدتوں انتظار کرنے والے مہمان کی طرح موت کو خیر مقدم کیوں نہ کہے در حالیکہ اس کے قلمرو حکومت کے دور افتادہ علاقہ کے کسی دردمند کا نالہ اس کے دل کو چیر دیتا تھا اور اس وسیع عالم نے اس کی زندگی کو ایک تاریک کنواں بنادیا تھا کہ دست و پابستہ ہو کر وہ ایک سکون کا سانس بھی نہ لے سکے۔ ایک ایسے حقیقی عدالت پسند کے لئے زندگی نہایت تلخ ہے جو اپنے قلمرو میں کسی عورت کے زیور چھنتے دیکھ رہا ہو اگر چہ وہ عورت مسلمان بھی نہ ہو۔

اگر عدل وعدالت کے سامنے تسلیم ہو جانا اور اپنے جان ومال وعیال وحکومت کو کچھ نہ سمجھنا اتنا باوقعت ہے جتنا علی علیہ السلام اپنے کردار کے ذریعہ انجام دیتے تھے، اگر کسی کے حق میں ظلم وستم ہونے سے ہراس ووحشت کرنا اس طرح ہے جس طرح علیؑ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ''اگر ایک چیونٹی کے منھ سے ایک چھوٹا سا تنکا چھیننے کے عوض مجھے پوری دنیا ومافیہا کو دینے کی پیش کش کی جائے تو میں اسے رد کر دوں گا۔'' اگر ایسا ہے تو حقیقت عدالت کا جاوداں وجود چیخ چیخ کر اعلان کرتا ہے کہ ''علیؑ موت کی ہلچل اور بعد از مرگ کے حوادث سے بالکل بھی ہراس نہیں کھاتا۔''

بنی آدم کی شرم آوری اور بے آبروئی سے پر مکمل تاریخ صاف صاف کہتی ہے کہ تف ہو بنی آدم پر کہ ان کے جنگ وجدال اور ظلم وجور کے تصور سے ان حوادث پر شاہد اس وسیع فضا اور سارے ستاروں کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ بنی آدم کی زندگی میں جنگ وجدال کے وقت انسانیت کے اصول کی پامالی اس قدر ظالمانہ اور ستمگرانہ ہے کہ جنگل کے وحشی جانور تک اتنے بے لگام نہیں ہیں۔ جس انسان کو معلوم ہو جائے کہ میرا دشمن آتش سوزی کے ذریعہ جلدی اور آزار واذیت میں اضافہ کے ساتھ مرے گا تو کیا وہ یہ کر سکتا ہے کہ اپنے دشمن کو پانی میں غرق کر کے مارے؟؟؟ ہرگز نہیں!

واقعاً! اگر پانی میں ڈبو کر مارنا یا تشنگی کے ذریعہ مارنا جلدی اور بہتر طور پر انجام پاتا ہے تو کسی صف آرائی اور شمشیر کشی کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔

صرف منادیان توحید کا نمائندہ علیؑ ایسا شخص ہے جس کو تاریخ نے اس عام قانون سے مستثنیٰ کیا ہے۔ جائیے اور زندگی علیؑ کو پڑھیے۔ آپ کو ملے گا کہ انسان نما جانور اور منحرف انسان معاویہ، جنگ صفین میں نہر فرات پر قابض ہو گیا تھا اور علیؑ کے لشکر کے اوپر پانی بند کر دیا تھا تا کہ اسلحے کے بغیر صرف تشنگی کے ذریعے ذرا سی مدت میں علیؑ کے لشکر کو شکست دے دے۔ پانی کی طرف حملہ کرنے اور نہر پر قبضہ کرنے کا فرمان علیؑ کی طرف سے صادر ہوا اور چھوٹے سے حملے کے ذریعہ نہر فرات علیؑ کے قبضہ میں آگئی۔ ظاہر ہے علیؑ کا لشکر بدلہ لینے کا ارادہ کرنے لگا لیکن علیؑ نے ایسے جنگی حالات میں بھی اصول انسانیت اور اسلامی قوانین کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ آپ نے اپنے لشکر کی بات کی مخالفت کی اور دشمن کے اوپر پانی کو بند نہ کیا

بلکہ ان کو پانی پینے کی دعوت دی چونکہ علیؑ کی منطق حیات اور علیؑ کی منطق زندگی میں جنگ، اصلاح انسان کے لئے ہوتی ہے نہ کہ نابودی انسان کے لئے۔

اسی طرح تاریخ انسانیت نے ابوطالبؑ کے پارسا اور متواضع فرزند کے علاوہ کوئی ایسا ہاتھ پیش نہیں کیا ہے کہ پچاس سال تک قبضۂ شمشیر جس کے قبضے میں رہا ہو لیکن ایک قطرہ خون ناحق نہ بہایا ہو۔

جس تاریخ نے علی علیہ السلام کی انسانی زندگی کو دیکھا ہے وہ اعلان کر رہی ہے کہ علیؑ موت کے شور وغل اور بعد از مرگ کے حوادث سے پریشان نہیں ہیں۔ علیؑ کی منطق میں جس موت سے ہر فرد اور ہر سماج کو ڈرنا چاہئے وہ ضمیر اور وجدان کی موت ہے چونکہ جو آدمی یا جو سماج خودغرضی اور خودخواہی کی اس حد تک پہنچ گیا ہو کہ جہاں زندگی کے تمام اقدار صرف ثروت اندوزی جیسی چیزوں کے لئے ہوں تو ایسا شخص اور ایسا معاشرہ تیزی کے ساتھ نیست ونابودی کی طرف جا رہا ہے۔ جس شخص اور جس اجتماع کا ضمیر اور وجدان مر جاتا ہے وہاں احساس ذمہ داری ختم ہو جاتا ہے اور جو اصول انسان کو جانوروں سے ممتاز کرتے ہیں اور اسے علم واخلاق ودین سکھاتے ہیں، وہ اپنی جگہ کو زندہ رہنے کی جنگ اور کمزوروں کے حقوق کی پامالی جیسی صفتوں کے لئے خالی کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف اس چرخ کہن کے نیچے ہر قوی کو ایک قوی تر اور ہر سیر کو سوا سیر مل ہی جاتا ہے اور ہر طاقتور اپنے مافوق کے ذریعہ نیست ونابود ہو کر رہتا ہے۔ یہی وہ موت ہے جس سے ہر آدمی ڈرتا ہے اور ڈرنا بھی چاہئے لیکن وہ زندہ دل شخص جو ہمیشہ ذمہ داری کی اہمیت کو بنی آدم کے سامنے بتاتا رہا اور خود کو قانون (جرم سے پہلے سزا منع ہے) کا کشتۂ تسلیم قرار دیتا رہا، ایسا شخص اگر موت کے سلسلے میں کچھ اظہار خیال نہ کرتا تو ذمہ داری کی مقدس وجاودانی حقیقت اپنی اس آواز کو دنیا والوں کے کانوں تک پہچا دیتی کہ:

"علیؑ موت کے شور وغل اور بعد از مرگ کے حادثات سے نہیں ڈرتا"

کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی موت سے ڈرتا ہو اور اپنے قتل کے بارے میں قاتل کے حتمی ارادے کے مقابل کوئی مواخذہ نہ کرے؟

کیا علی علیہ السلام کیلئے یہ ممکن نہ تھا کہ منحرف انسانوں کی طرح اپنی شاہانہ طاقت کے ذریعہ قوانین کو

اپنی خواہشات کے مطابق موڑ دیتے اور زمین کو جرم و جنایت کے مجسمہ ابن ملجم مرادی کے وجود سے پاک کر دیتے؟

اگر پیشوایان تو حید کا مکمل نمونہ، علیؑ موت سے ذرا سا بھی گھبراتا ہوتا تو ثروت اندوزی اور کرسی کی طمع رکھنے والوں اور علیؑ کو اپنی راہ کا پتھر سمجھنے والوں کے شہر کے اندر شب کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روز روشن کی طرح بغیر اسلحہ اور بغیر محافظ کے آمد و رفت نہ کرتا۔ وہ انسانیت کا اکیلا مکمل مصداق جو فریضہ کی ادائیگی کے لئے ہر دن چند بار اپنی مرضی سے قلمرو مرگ میں قدم رکھتا تھا، اس نے موت کو بھی مبہوت کر دیا تھا۔ خود موت بھی اسکی حیرت انگیز زندگی کی طرح چیخ رہی تھی:

" علیؑ فتنۂ موت اور بعد از مرگ کے آشوب سے نہیں ڈرتا "

آخر وہ پارسا اور طاقتور زمامدار جو اپنے دور حکومت میں لباس کے پیوند کی زیادتی کے سبب درزی کے سامنے شرمندہ تھا، جو اپنی مکمل زندگی میں ناتواں اور طاقتور کو ایک نگاہ سے دیکھتا رہا، جس نے اپنی شمشیر براں سے تباہ کاروں کا خون بہانے اور ہر جنگ خانماں سوز میں سب سے آگے رہنے کے باوجود اور انتقام جوئی کے سبب انسانیت کو سلب کرنے والے سیکڑوں حوادث میں شرکت کرنے کے باوجود اسی شمشیر سے کبھی ایک قطرۂ ناحق نہ بہایا۔ جو قریب المرگ کر دینے والے زخم کھانے کے باوجود اپنے قاتل کی غذا کو نہ بھولا، جس نے اولاد میں پدر کشتگی کے سبب ہونے والے ہیجان اور جوش و خروش پر کنٹرول رکھا، جس نے میدان مرگ سے گزرتے وقت اپنے پیوند زدہ لباس کو اتار کر احرام کے لباس کے مانند معمولی سا کفن پہن کر اپنے معبود کی طرف روانگی اختیار کی، ایسے شخص کو کونسی فکر پریشان کر سکتی ہے؟ خداوند اعلیٰ کی قسم! وہ لباس، وہ شمشیر، وہ انسان جس کی قدر علی علیہ السلام کے سبب ہے، وہ محنت و راحت سے بھرا ہوا دل، وہ معمولی کفن اور حتی وہ جرم و جنایت کا مجسمہ قاتل اس بات پر گواہ ہیں کہ

" علیؑ فتنۂ موت اور بعد از مرگ کے حوادث سے کبھی نہیں گھبرایا۔"

آن نیمے شبے کہ آب حیاتش دادند

(جس رات اسے آب حیات دیا گیا)

سورج نے اپنے زرد چہرے کے ساتھ چند گھنٹوں کے لئے آسمانی خیموں کو وداع کہہ دیا تھا اور شب نے سونے والوں کے لئے اپنے تاریک پردوں کو پہاڑوں، بیابانوں، درختوں، امرا کے قصروں اور غربا کی جھونپڑیوں کے اوپر لٹکانا شروع کر دیا تھا۔ آسمانی ستارے ہمیشہ کی طرح لامحدود سمندر میں بڑے سکون سے تیر رہے تھے۔ بنی آدم کے لبوں پر طاقت فرسا محنتوں کے سبب تھک چکنے کے بعد نا معلوم سا تبسم تھا۔ کسان اپنے چھوٹے گھروں میں چلے گئے تھے۔ کاروانوں کی آوازیں بھی کارواں والوں کی طرح خاموش ہو گئی تھیں یہاں تک کہ اہل دل بھی تخیلات کی وسیع و عریض فضا میں اڑتے اڑتے۔ بے حال ہو کر خاموشی کے تکیہ پر سر رکھ چکے تھے لیکن عالم مادیات کے تاریک پردے اب بھی علی علیہ السلام کی نظروں کے سامنے حائل نہیں تھے۔ علیؑ کے یہاں روحی آندھیوں کا وقت آ گیا تھا، کبھی اپنے نفس کا محاسبہ کرنے لگتے، کبھی کوفہ کے بیابانوں میں رات کا کچھ وقت فکر و تدبر میں گزار دیتے اور کبھی کسی یتیم، کسی بیوہ یا کسی دردمند کو دیکھنے چلے جاتے تا کہ دیکھیں کہ وہ بھی سکون قلب کے ساتھ محو استراحت ہیں یا نہیں؟

مزخرف صفحات کو دلیل بنا کر تاریخ تیار کر لیتے ہیں اور پھر خود مسلمانوں کے درمیان واپس بھیج دیتے ہیں۔ نتیجے میں سادہ لوح مسلمان تحقیق ودقت نظری کے بغیر ان کو قبول بھی کر لیتے ہیں اور جب بیکار ہوں اور تاریخ بیان کر کے اس پر تبصرے کرنے لگیں تو سب سے پہلے یہ جھوٹ کا پلندہ پیش کر دیتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام بہادر اور متقی و پرہیزگار تو تھے مگر (نعوذ باللہ) ماہر سیاستداں نہیں تھے نیز یہ کہ اس سلسلے میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ان چند کلمات کے ذریعے اپنی اس گھٹیا اور بے بنیاد تحقیق کو بیان کرتے ہیں اور پھر گوشہ نشیں ہو جاتے ہیں۔

اس قسم کے فیصلے اس وجہ سے سامنے آتے ہیں کہ حضرت علیؑ اور صدر اسلام کے واقعات وحادثات کا گہری اور باریک نظر سے مطالعہ نہیں کیا گیا ہے نیز سیاست وسیاستداں ہونے کی حقیقت کو نہیں سمجھا گیا ہے۔

بہر حال اس قسم کی عمدی یا غیر عمدی غلطیوں کا ازالہ کرنے کے لئے ان چند صفحات کو قید تحریر میں لایا گیا ہے تا کہ ان کا مطالعہ کرنے والے ایک ایسی حقیقت سے آشنا ہو جائیں جس سے بشریت کی سرنوشت وابستہ ہے۔

کبھی مسجد کوفہ کے در و دیوار ان کے حزن و ملال اور شور و اشتیاق کے نالوں سے لرز اٹھتے تھے، کبھی اپنے رنج دیدہ اور خستہ اعضا پر رحم کھا کر اپنی حق بین نگاہوں کو تھوڑی دیر کے لئے تباہ کاروں سے اٹھا لیتے تھے۔

ابھی انسانوں اور جانوروں کے کان اور دل گہری نیند میں تھے کہ علیؑ کے ہمیشہ بیدار دل نے انکی خواب آلود آنکھوں کو محبت سے دیکھا اور انہیں مناجات سحر کے لئے آمادہ کرنے لگا۔ اس طرح علیؑ کی آنکھیں دوبارہ اس دنیا کی طرف چلی آئیں۔ تعجب کی بات ہے کہ جو نسیم سحر، پہاڑوں، دروں، جنگلوں اور ستاروں کو اپنے ہلکے سے اشارے سے وادی خواب میں کھینچ لے گئی تھی وہ بڑے فخر و ناز کے ساتھ علیؑ کے پاس آئی اور یہ سوچ کر علیؑ کے رنجیدہ اعضا کی دلجوئی کرنے لگی کہ اپنے ٹھنڈے سانسوں سے علیؑ کے سوختہ دل کو کچھ سکون بخش سکے۔ سوچا شاید اس طرح علیؑ کے دل مشتاق کے سورج کو چند لمحے مغرب خواب میں روکے رکھے تاکہ یہ سورج صبح صادق کے وقت طلوع ہو۔

لیکن یہ خام خیالی تھی، شاید اس کو پتا ہی نہیں تھا؟

فجر تا سینۂ آفاق شگافت   چشم بیدار علیؑ خفتہ نیافت

علیؑ کیسے تاریک شب سے مانوس نہ ہو جبکہ جاودانی آب حیات اس نے اسی تاریک شب کی سحر میں پیا ہے۔ اس رات بھی اسنے دوسری راتوں کی طرح وضو کیا اور اپنی شکستہ کمر کو جاودانی سفر کے لئے باندھ لیا لیکن آج کے اٹھنے والے قدم گزشتہ شبوں کی طرح نہیں تھے۔

صرف وہ حیوانات ہی نالہ وفریاد نہیں کر رہے تھے جو علیؑ کے پیوند زدہ دامن کی نسیم صبح سے مضطرب ہو جاتے تھے۔ صرف راستہ کے در و دیوار ہی آخری سلام نہیں کر رہے تھے بلکہ وہ نیلگوں فضا اور وہ ستارے جن کے سامنے لاکھوں بلکہ کروڑوں حوادث گزر چکے تھے اور ان کی پیشانی پر شکن تک نہ آئی تھی، ایسے وجود بھی رقت بار نگاہوں سے علیؑ کو دیکھ رہے تھے۔

علیؑ بھی روشن نگاہوں سے انھیں دیکھ رہے تھے گویا آہستہ آہستہ زیر لب کہہ رہے ہوں کہ...

میں بھی ان کاروانوں میں مل جاؤں گا جو دستہ دستہ ہو کر اس عالم کہنہ سے رخت سفر باندھ کر تاریک قیامگاہ میں ڈیرا ڈال چکے ہیں۔ اے مینا رنگ کے خیمے!!! اے کمر خمیدہ نیلگوں!!! اے بے شمار ستاروں والے

آسمان! تو نہ ان کے فراق میں رویا اور نہ ہی تو نے ان کی بازگشت کا انتظار کیا! ویسے تو حق بجانب ہے کیونکہ جو کچھ بھی تو نے اپنے صفحات دفتر پر ان انسانوں کے بارے میں ثبت کیا ہے اس پر بغیر شرمندگی کے نگاہ نہیں ڈال سکتا۔

کہیں آنے والے اپنی تباہ کاریوں کو تیرے نام سے ثبت نہ کردیں، اس لئے جو قدم میں اس وقت اٹھا رہا ہوں اور باعظمت فریضے کے حضور جا رہا ہوں اسے اپنی سرخروئی کے لئے اپنی کہن سال یادداشت میں ثبت کرلے اور اپنی ذمہ داری کو بنھانے کے لئے جو میں نے آخری تیر چھوڑا ہے اس کی تصویر کو اپنے آبی رنگ کے صفحہ پر نقش کرلے۔

کیا کروں! حقیقت انسان کو بیان کرنے والی کتاب کے پڑھنے کی فرصت ختم ہو چکی ہے۔

اس کتاب کے شروع کے صفحات کو کھول کر اولاد آدم کے لئے چند سطریں پڑھ رہا تھا کہ میری زندگی کے صفحات ہی ختم ہو گئے۔

دگرم بوارق غیب جاں زقیود کردہ مجردا
طیران مرغ زحدتن دگرم کشیدہ بلا حدا

چند مرغابیوں نے اس کی وقتی قیامگاہ سے اس کو وداع کہا۔

جس کمر شکستہ نے ایک عمر تک فرد و معاشرے کی اصلاح کے لئے اپنی کمر باندھی تھی؛ آج استقبال مرگ کے لئے کمر باندھ چکا تھا۔ سیاہ بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہلکی ہلکی سی باد سحری کے ساتھ چل رہے تھے۔ وحشت اور سکوت اب بھی تمام موجودات کے اوپر حکم فرما تھا۔ چاند اس طرح سراشیب سے زرد چہرے کے ساتھ علیؑ کی پیشانی کو دیکھ رہا تھا جیسے اپنے کئے پر پشیمان ہو، بڑی یاس و ناامیدی تھی اس کے چہرے پر! ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ جرم و جنایت کا مجسمہ اور روباہ صفت قاتل سمجھ گیا ہے کہ وہ ہزاروں خوف و ہراس کے باوجود اپنے خائن ہاتھ کو اس شیر دل کی طرف اس وقت بڑھا سکتا ہے جب علیؑ خدا کے حضور پرچم عبادت اٹھائے ہوں اور اپنی تمام تر قوتوں کو اس رب کی عظمت کے سامنے کھو دیا ہو۔ ہاں!! اس کی زندگی کے پہلے دن خانہ کعبہ نے اپنی آغوش میں اس کا خیر مقدم کیا اور زندگی کے آخری لمحات اس نے الٰہی

پرستشگاہ میں طے کئے اور خدا سے ملاقات کے سفر کا آغاز محراب عبادت سے کیا۔ ان دو عبادتگاہوں کے درمیان کے حصے کو خدائے پاک کی عبادت میں گزارا چاہے وہ میدان جنگ ہو یا دنیائے سیاست، محراب عبادت ہو یا تختِ حکومت، یتیموں اور بیواؤں کی گلی ہو یا کسی دردمند کا گھر۔ عیادت کو آنے والوں کے لئے علیؑ کا بستر مرگ، موت وحیات کی آخری درسگاہ تھا۔

یہ مطلب نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے رشتہ داروں یا دوسرے لوگوں کو میدان جنگ یا بستر مرگ پر دم توڑتے نہیں دیکھا تھا۔

لیکن ایسا حکمت وشجاعت و پرہیزگاری وعدالت کا مجسمہ نہیں دیکھا جو نا قابل برداشت اور طوفانی زخموں کے مقابل تعجب خیز سکون اور ٹھہراؤ کا مظاہرہ کرے۔ ایک ایسے کوہ پیکر کو دیکھ رہے تھے جسے عالم انسانی کے جنایت کار کی زہر آلود شمشیر نے ایک خزاں دیدہ زرد پتہ بنا دیا تھا۔ ایک زرد صورت کو دیکھ رہے تھے افسردہ لبوں کے ساتھ! جس نے اپنی زندگی میں ''اصلاح'' و ''سعادت جاودانی'' کے علاوہ کوئی چیز نہیں کہی تھی۔ اسکی عیادت کرنے والے اور اسکی ''مطالعہ نشدہ'' کتاب نہج البلاغہ کہتی ہے:

وہ اسی مرگبار اور وحشت انگیز حالت میں قرآن کی سفارش کر رہا تھا، توحید کی تاکید، نظم وضبط کا حکم دے رہا تھا۔ آپسی دشمنیوں کے ختم کرنے اور اصلاح ذات البین کا تاکید کے ساتھ حکم صادر کر رہا تھا۔

یتیموں کا خیال رکھنے کو یاد دلا رہا تھا۔

اور کبھی کبھی باعظمت کلمہ ''لا الہ الا اللہ'' کو دہرا کر سننے والوں بلکہ پورے عالم کو دہلا دے رہا تھا۔

کہتے ہیں کہ وہ افسردہ سے لبوں سے ابھی انہیں جملوں کو دہرا رہا تھا کہ اس نے ہمیشہ کے لئے اس جہان سے آنکھیں بند کر لیں اور ابدی جہان کے لئے آنکھیں کھول دیں اور حقیقی زندگی کو شروع کر دیا۔

فسلام علیہ یوم ولد ویوم یموت ویوم یبعث حیاً

علامہ **محمد تقی جعفری** اعلی اللہ مقامہ کا شمار دور حاضر کے ان انگشت شمار افراد میں ہوتا ہے جو شاذ و نادر ہی عالم وجود میں آتے ہیں۔

علامہ کسی ایک علم کے ماہر نہیں تھے بلکہ انکا خاصہ ہی یہ تھا کہ مختلف النوع علوم اعم از فلسفہ، عرفان، کلام، فقہ حتیٰ نفسیات، جامعہ شناسی و اقتصادیات تک آپ کی عمیق دسترسی تھی۔ آپ کے ذریعے تالیف شدہ مختلف کتابیں اس کا واضح اور بین ثبوت ہیں۔ آپ نے جہاں فلسفہ و عرفان میں اپنے قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں وہیں فارسی ادب میں بھی آپکی خامہ فرسائی قابل دید ہے۔ نفسیات کا موضوع ہو خواہ جامعہ شناسی، آپ ہر میدان کے شہسوار نظر آتے ہیں اور نہ فقط اسلامی علوم آپ کی دسترس میں تھے بلکہ مغربی علوم میں بھی آپ کا عمیق مطالعہ تھا۔ ابھی آپ کا سن مبارک فقط ۳۲ر سال ہی تھا کہ آپ کی شہرۂ آفاق کتاب "**ارتباط انسان و جهان**" منظر عام پر آ گئی تھی۔ مذکورہ کتاب کے سلسلے میں آپ نے تقریباً ۲۵۰۰ر کتابوں کا مطالعہ فرمایا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس سن و سال میں شاذ و نادر ہی کسی کا اتنا وسیع و عمیق مطالعہ دیکھنے میں آتا ہے۔

علامہؒ کی حیات کا عظیم ترین کارنامہ نہج البلاغہ کے حوالے سے آپکی فارسی زبان میں مبسوط ترین شرح ہے۔ لیکن ہزار افسوس کہ آپ کی زندگی نے وفا نہ کی اور مذکورہ شرح ناتمام رہ گئی۔۔۔

LYTZ ACADEMY
LUCKNOW - INDIA

سیاست کی تعریف

بہت سے دوسرے اہم الفاظ کی طرح سیاست کی تعریف بھی اختلاف نظر کا شکار ہے لیکن یہاں پر ان سب کے ذکر کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ فقط مندرجہ ذیل تین تعریفوں کا ذکر کافی ہے:

(ا)۔سیاست یعنی" **انسان و حکومت اور معاشرے و حکومت کے درمیان رابطے سے آشنائی**۔" اس مختصر تعریف کو بعض مورخین اور اہل سیاست نے بیان کیا ہے لیکن جیسا کہ واضح ہے، یہ تعریف سیاست کی مکمل طور پر منظر کشی سے قاصر ہے کیونکہ اس میں دوسری قوموں اور حکومتوں نیز وہاں رہنے والے افراد سے تعلقات کا ذکر نہیں ہے۔ جبکہ اس قسم کے تعلقات و روابط بھی اچھی خاصی اہمیت کے حامل ہیں اور سیاست کا اہم حصہ ہیں، ان سب کے علاوہ اس تعریف کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں ایک خاص نکتہ کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے اور وہ یہ کہ اس تعریف میں قدرت و طاقت کا تذکرہ نہیں ہے۔ جب کہ یہ عنصر چونکہ مذکورہ روابط پر پوری طرح مؤثر ہوتا ہے لہذا سیاست کا جزء لاینفک ہے۔

(۲)۔ارسطو نے سیاست کی تعریف اس طرح کی ہے:

''ضروری ہے کہ ہر مجموعے کا اہم ترین موضوع سب سے اچھی نیکی قرار پائے اور اسکا نام حکومت و سیاست رکھا جائے۔'' (السیاستہ لارسطوطالیس ص /۹۱ک/اب/اف/۱)

اسی طرح کا ایک جملہ صفحہ/۲۱۲ک/۳ب/۷ف/اپر بھی ملتا ہے:

''تمام علوم وفنون کی غرض، خیر و نیکی ہے لہذا سب سے عمدہ نیکی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان علوم کے درمیان اہم ترین علم یعنی علم سیاست کا موضوع قرار پائے۔''

یہ جملہ یونانی عبارت کا تیسرا ترجمہ ہے اور ممکن ہے کہ یونانی سے فرنچ زبان یا فرنچ سے عربی زبان میں ترجمہ کئے جانے کی وجہ سے کچھ کمی بیشی ہوگئی ہو (اردو ترجمہ پانچواں شمار کیا جائیگا۔مترجم) لیکن پھر بھی جس مقدار میں ہمیں تعریف کی ضرورت ہے وہ یہاں پر واضح ہے۔لہذا ارسطو کے نظریے کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے: ''سیاست سے مراد بہترین نیکی کی طرف قدم بڑھانے کے لئے مجموعوں اور گروہوں کے رابطے کی تائید، تغییر یا پھر ان کا ایجاد کرنا ہے۔'' یہ تعریف افلاطون کی کتاب ''جمہوریت'' کے بعض مضامین میں بھی ملتی ہے۔یہاں پر لازم ہے کہ اس تعریف کی مختصر سی وضاحت کی جائے۔

عدالت، نیکی، حق وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو ہر انسان یا ہر معاشرے اور حکومت کا نصب العین شمار کئے جاتے ہیں۔اسی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہے کہ تاریخ بشریت میں کوئی ایسا انسان یا معاشرہ وحکومت مل جائے جو خود کو ان کا حامی نہ سمجھتا ہو۔حتی اگر آپ فساد کرنے والوں سے بھی پوچھیں کہ جس راستے کو تم نے اختیار کیا ہے وہ کیسا ہے؟ تو جواب دیں گے کہ ہمارا راستہ نیکی، عدالت اور حق کا راستہ ہے۔اسی طرح اگر چنگیز خان جیسے بدترین حکمراں سے بھی پوچھیں کہ اس خونریزی اور غارت گری میں تمہارا کون سا مقصد پنہاں ہے، تو گزشتہ جواب ہی کی طرح وہ بھی نیکی، عدالت اور حق ہی کا حوالہ دے گا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ تمام افراد، معاشرے اور حکومتیں اسی نیکی کی تلاش میں یا اس کو بروئے کار لانے کی سعی میں مصروف ہیں۔اس نفسیاتی پہلو کا انکار کسی سے ممکن ہی نہیں ہے کیوں کہ یہ بات مرحلۂ یقین تک پہنچ چکی ہے۔اس نکتے کے تحت اب ارسطو کی تعریف کو مندرجہ ذیل وضاحت کے ساتھ بخوبی سمجھا

جا سکتا ہے۔

چونکہ خیر و نیکی ہر فرد، معاشرے اور حکومت کا مطمح نظر ہے، لہٰذا اس ہدف کو حاصل کرنے کے وسائل و ذرائع بھی ہونے چاہئیں اور وہ علم جو ان وسائل کی کیفیت اور مقدار کو پیش کرنے کا ضامن ہے، علم سیاست کہلائے گا۔ اس طرح اگر سیاست کی تعریف وہی ہے جسے ارسطو نے پیش کیا اور ہم نے اس کی مختصری وضاحت پیش کی تو یہ بہترین علم کہلائیگا اور اس کا علم رکھنے والی شخصیت سب سے اہم اور بزرگ ہستی شمار کی جائے گی۔

(۳)۔ سیاست کی تیسری تعریف ایسی ہے جو عوام الناس کے درمیان غیر مانوس ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی حلقے میں ناپسندیدہ اور قابل نفرت ہے۔ اس کے مطابق سیاست کی تعریف یہ ہے:

''سیاسی افراد کے ذریعے ہدف کا معین کیا جانا اور اسے ہر طرح سے حاصل کرنے کی سعی و کوشش''

اس تعریف میں نیکی وسعادت وغیرہ کا بالکل ذکر نہیں ہے بلکہ اس میں دراصل انسانیت ہی کا عمل دخل نہیں دکھائی دیتا۔ اس تعریف کو بنیاد بنا کر کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح ایسے وحشی درندے جو حصول اقتدار کی خاطر ہر طرح کا فعل درست سمجھتے ہیں، سیاستداں کہلائیں گے۔

سیاست کی مذکورہ تعریف اشپینگلر نے لکھی ہے، وہ کہتا ہے:

> ''ایک فطری سیاستداں کے نزدیک حق و باطل کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ حادثات وواقعات کو نظام اور طریقۂ کار سے ملانے کی بھول کبھی نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک حقیقت اور اشتباہ میں صرف فرق ہی نہیں ہوتا بلکہ ہر ایک کی الگ حیثیت ہوتی ہے۔ وہ ہر ایک کے اسباب وعلل پر پوری طرح غور وخوض کرتا ہے اور ان کے اثرات کو اپنے اقتدار واختیار کی سرنوشت قرار دیتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر سیاستداں کچھ خاص قسم کی عقیدتوں سے وابستہ ہوتا ہے اور انکا پوری طرح احترام کرتا ہے اور اگرچہ یہ چیزیں اسکی فردی وذاتی زندگی سے متعلق ہوتی ہیں لیکن مرحلۂ عمل میں ان عقیدتوں سے خود کو جدا نہیں کر پاتا۔ گوئٹے کے بقول: ''کسی فکر کو عمل کی دنیا میں لانے والا، انصاف اور ذہنی توجہ کو بروئے کار نہیں لاتا بلکہ یہ چیزیں دیکھنے

والوں سے مخصوص ہوتی ہیں۔'' یہ حقیقت مکمل طور پر تمام سیاستدانوں سولا سے لے کر بیسپیر تک اور مارک سے لے کر ریبیٹ تک ہر ایک کے یہاں پائی جاتی ہے۔ بڑے بڑے پوپ اور انگریزی لشکر کے تمام سپہ سالار جب تک حالات پر قابو پانے کے لئے سخت قسم کی کشمکش اور سختی میں مبتلا رہے، ان لوگوں کی طرح دکھائی دئے جو کسی علاقے کے فاتح ہوں یا تازہ برسر اقتدار آئے ہوں۔ مثال کے طور پر پوپ انوسان سوم کی کوششوں کے نتیجے میں قریب تھا کہ پوری دنیا کلیسا کے زیر اقتدار آجائے۔ یہیں سے اس کی کامیابی اور فتح کے راز کو سمجھا جا سکتا ہے کیوں کہ اس نے ہدف کے حصول کی خاطر ہر طرح کے آپریشن کو صحیح سمجھا جبکہ یہ سب آئین اخلاق و مذہب کے بالکل خلاف تھا۔''

(فلسفۂ سیاست: اوسولڈ اشپنگلر ص/۳۹-۴۰)

صدیوں سے لفظ سیاست کے سلسلے میں بیان کی جانے والی یہ غلط تعریف سیاستدانوں اور حکمرانوں کی اس روش کی عکاس ہے جس کے مطابق انسانی گروہ بلکہ تمام مخلوقات و موجودات اس لئے خلق ہوئے ہیں تا کہ یہ افراد ان پر حکومت کر سکیں۔ اسی لئے اگر کبھی کسی سیاستداں کی زبان پر عدالت، مظلوموں کی حمایت، نظم وضبط جیسے الفاظ جاری ہو جاتے ہیں تو ان کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی بلکہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ سب نچلے طبقے کا دل لبھانے اور اپنی حکومت کو مزید مستحکم کرنے کی چالیں ہیں۔

اس تلخ حقیقت کی روشنی میں کیسے ممکن ہے کہ ایک سیاستداں سے انسانیت اور دین کے آئین و قوانین کے پاس ولحاظ کی توقع رکھی جائے۔

حضرت علیؑ
کی سیاست

گزشتہ وضاحت کے ذیل میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حقیقت کے متلاشی اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ اگر سیاست سے مراد وہ ہے جسکو تیسری تعریف کے طور پر بیان کیا گیا ہے نیز جس کی تشریح اوسولڈ اشپینگلو نے کی ہے تو یقین جانئے حضرت علیؑ ایسی سیاست سے پوری طرح واقف تو تھے مگر اس پر عمل پیرا نہ تھے چونکہ حضرت علیؑ انسان کی حقیقت اور مقام و منزلت سے مکمل طور پر آگاہی رکھتے تھے لہذا یہ ممکن نہیں ہے کہ چندروزہ فتح وظفر کی خاطر ایسے غیر انسانی امور کو انجام دیتے۔ وہ علیؑ جو ایک معمولی سی لڑکی کے پیر میں موجود تل کے ناحق مٹادئے جانے پر اتنا ناراض ہو جائے کہ اپنی زندگی کو خیر باد کہنے پر آمادہ ہو جائے، وہ علیؑ جو ایک حقیری چیونٹی کی بے ضرر اور محترم زندگی کو پوری دنیا کی حکومت پر مقدم قرار دے، وہ علیؑ جس کی توجہ جنگ میں تلواروں کی جھنکار کے درمیان بھی اس بات کی طرف ہو کہ کسی کا ناحق خون نہ بہہ جائے۔

بہت بڑی بھول ہوگی اگر ایسی ہستی کو خونخواروں اور ظالموں کے گروہ میں تلاش کیا جائے۔ یہ شخص تو کاروان توحید کے رہبروں میں ملے گا۔ ہاں! بلاشبہ حضرت علیؑ، خلیل خدا ابراہیم یا جناب موسیٰ و جناب عیسیٰ علیہم السلام جیسے باوقار بندگان خدا، نمرود، چنگیز خان اور نپولین وغیرہ سے کوئی شباہت نہیں رکھتے۔ یہ

بزرگانِ عالم ایک عام انسان پر بھی حکومت نہ رکھنے کے باوجود پوری دنیا کو اپنے حیطۂ اقتدار میں لا کر ہر طرح کے مظالم ڈھانے والے چنگیزوں کے مقابل زیادہ با اقتدار و با اختیار نظر آتے ہیں۔

اگر حقیقی سیاست کو مدنظر رکھا جائے تو حضرت علیؑ اس میدان کے شہسوار نظر آئیں گے بشرطیکہ اس نکتے کی طرف توجہ رہے کہ چندروزہ زندگی کی فتح وظفر اور جسموں پر حکومت سے کہیں بہتر ایسی فتح وظفر اور دلوں کی حکمرانی ہے جو ہیشگی اور ابدیت رکھتی ہو کیونکہ زور زبردستی سے وقتی طور پر حاصل ہونے والی سلطنت اس خوفناک خواب کے مانند ہوتی ہے جو کچھ دیر کے لئے سونے والے کو ڈرا کر ختم ہو جائے اور انسان بھی بیدار ہو کر دوبارہ اپنے امور زندگی میں لگ جائے۔

آج تک وحدانیت کے علمبرداروں کا نورانی وجود لوگوں کے ذہنوں پر حکومت کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ گمراہ ترین آدمی بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں رکھتا کہ جناب ابراہیمؑ، جناب عیسیٰؑ و جناب موسیٰ (العیاذ باللہ) اس روئے زمین پر تباہی پھیلانے والوں میں سے تھے، جبکہ صورت حال یہ ہے کہ اگر کسی سیاستداں کا خیال ذہن میں آجائے تو ایک دنیا پرست اور ناپسندیدہ آدمی کا تصور پیدا ہو جاتا ہے۔

اب ذرا دیر ٹھہر کر او سو لڈا شپینگلر کے اس بیان کا بھی مطالعہ کر لیں:

''سیاست کا سب سے پہلا مسئلہ، شخصیت کو ثابت کرنا ہوتا ہے۔ دوسرا مسئلہ اگرچہ ظاہر نہیں ہوتا لیکن بہت مشکل ہوتا ہے اور اس کے اثرات ونتائج بھی دیرپا ہوتے ہیں۔ وہ روش اور طریقہ کار کو بروئے کار لانے اور اسے ہمیشہ برقرار رکھنے کا ہوتا ہے۔ ایک سیاستداں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس طرح سے دوسروں پر تسلط اختیار کرے کہ اس کی روش کو وہ لوگ بھی اختیار کر کے اسی کے سے حوصلوں اور جذبوں کے ساتھ تمام کام انجام دیں۔ اس کی ذمہ داری ہے کہ بعض وظائف کے لئے ایسے ماحول اور حالات پیدا کر دے جن کی بقا کے لئے اسکی موجودگی ضروری نہ ہو۔ عصر قدیم میں اگر اس مرحلے میں کوئی سیاسی راہنما کامیاب ہو جاتا تھا تو اسے خدا کی خاص عنایت شمار کیا جاتا تھا۔ اس طرح وہ نئی زندگی کا موجد اور جدید تصورات

کا بانی قرار پاتا تھا۔ یہ انسان، بشری پیکر میں ہونے کی وجہ سے چند سالوں کے بعد اس کارگاہ ہستی سے رخت سفر باندھ لیتا ہے لیکن اس کے مکتب کی پروردہ کچھ شخصیتیں اس کی راہ وروش کو جاری رکھ کر اس کو ایک لمبے عرصے کی حیات عطا کردیتے ہیں۔ معاشرے کو ایک خاص قسم کی سیاسی نہج پر ہمیشہ کے لئے گامزن کردینا، صرف ایک ہی شخص کا تنہا کام کہلاتا ہے اور اس کی نہج کے نقوش، تاریخ بن کر اس معاشرے پر چھا جاتے ہیں۔ اس وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ ایک اہم اور بڑا سیاستداں، نادرالوجود ہوتا ہے۔"

(فلسفۂ سیاست: اوسولڈ اشپینگلر ص/۴۳)

یہ بیان کسی قسم کی وضاحت کا محتاج نہیں ہے۔ اچھی طرح سے اس کا مطالعہ فرمایئے اور ہر طرح کی تقلید یا ہوا و ہوس کے بغیر گزشتہ صفحات میں ذکر شدہ دو طرح کے سیاستدانوں پر اسکی مطابقت کر کے غور کیجئے کیا یہ حقائق ایک عام قسم کے سیاستداں پر منطبق ہوتے ہیں یا پھر حضرت علی علیہ السلام پر۔

میں یہاں پر گزشتہ جملوں میں سے بعض کی تشریح کرتے ہوئے چاہوں گا کہ قارئین محترم کے افکار سے مدد حاصل کروں تا کہ مغالطے اور دھوکہ دھڑی میں پھنسے ہوئے بعض سادہ لوح افراد کو راہ نجات مل سکے۔

اشپینگلر کے بیان میں یہ جملہ تھا کہ "سیاست کا سب سے پہلا مسئلہ شخصیت کو ثابت کرنا ہوتا ہے" یہاں پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ عمرو بن عاص کی شخصیت کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو جان بچانے کے چکر میں برہنہ ہو جانے اور ایک مرد کے مقابلے میں زنانہ انداز اختیار کرنے تک کو قبول کر لے! اسی طرح معاویہ کا مسلمانوں کے رئیس کو قتل کرنے کی خاطر ایک اجنبی شخص کا کاندھا استعمال کرنا کس طرح ایک اچھی شخصیت کو ثابت کر سکتا ہے۔ کیا پانی پر پابندی، وہ بھی ایسے حالات میں جبکہ دشمن پیاس سے ہلاک ہو رہے ہوں، شخصیت کو نکھارنے کا طریقہ سمجھا جائیگا؟

اس کے علاوہ، اشپینگلر کا بیان ہے: "حقیقی سیاستداں وہ ہے جو اپنی باطنی قوت کو بروئے کار لا کر غیر محدود زمانے پر اپنے نقوش ثبت کردے۔" ہر ایک جانتا ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ اول زندگی اور

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اقلیتی گروہ میں شمار کئے جاتے تھے۔ اس کا سبب عام لوگوں کا آپ کے نظریات سے اختلاف وگریز تھا لیکن اس کے باوجود رفتہ رفتہ آپ نے تمام دنیا کو اپنی روحانیت، حکمت اور حکیمانہ روش کا گرویدہ بنالیا تھا۔

تاریخ بشریت نے آئین سیاست کے کسی اور ایسے علمبردار کو پیدا نہیں کیا جس کا فریفتہ ہوکر مشہور مادہ پرست شبلی شمیل اس طرح مدح خوانی کرنے لگے:

''علیؑ ایک ایسا رہبر ہے جو بزرگوں کا بھی سردار ہے، ایک ایسا نادر نسخہ ہے جس کی مثال گزشتہ زمانے سے لے کر دور حاضر تک نہ تو مشرق میں مل سکتی ہے اور نہ ہی مغرب کی سرزمین لاسکتی ہے۔''

اگر تاریخ کا مطالعہ عقیدتی تعصب کی عینک اتار کر کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کا کوئی بھی رہبر ایسا نہیں ہے جس کی پیروی کرنے والوں کو ایسے شکنجوں میں رکھا جائے کہ وہ اپنے رہنما کا نام بھی لینے کی جرأت نہ کریں۔ دشمن ایسی سختیاں کرے جن سے زیادہ کا تصور بھی ممکن نہ ہو۔ ان سب کے باوجود دوسروں کی کسی بھی قسم کی مدد کے بغیر دین کی اس سب سے عظیم شخصیت کا نام کتاب انسانیت کی سطر اول میں لکھا گیا۔

آج جبکہ ہم ایسے دور سے گزر رہے ہیں جب علمی میدان میں کامیابی کے علاوہ انسانی اقدار کو بھی شخصیت شناسی کا معیار قرار دیا جاتا ہے، پھر بھی تمام ملتیں جس ذات کی سب سے زیادہ تعظیم کررہی ہیں اسے علی بن ابیطالبؑ کہتے ہیں حتی وہ افراد جو کسی بھی دین کے پابند نہیں ہیں وہ بھی اس ہستی کی بارگاہ میں جبین نیاز خم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر نادانی کے باعث کوئی قوم حضرت علیؑ کی شخصیت کے بارے میں کوئی نازیبا لفظ استعمال کردے تو پوری دنیا میں اس کے خلاف نفرت وغصے کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ حقیقی طور پر حضرت علی علیہ السلام کی سیاست کا مقدمہ بالکل اسی طرح فراہم ہوتا گیا جس طرح جناب ابراہیمؑ کے ساتھ ہوا کہ عام قسم کے سیاستدانوں کے برخلاف ان بزرگوں کی شخصیت روز بروز محبوب تر ہوتی گئی اور بغیر تفریق مذہب وملت ہر ایک انکا شیفتہ اور گرویدہ بنتا گیا۔

بعض کج فہم افراد کہتے ہیں: ''اچھا سیاسی راہنما وہ ہوتا ہے جسکا معاشرے میں سب سے زیادہ رسوخ

ہو۔" جبکہ رسالت مآبؐ کی رحلت کے بعد حضرت علی علیہ السلام پورے اسلامی معاشرے میں رسوخ پیدا نہ کر سکے۔ گویا انکے مطابق رسوخ کے معنی یہ ہیں کہ شمشیر بدست ہو کر جسطرح بھیڑ بکریوں کو ہنکایا جاتا ہے، عام انسانوں کو بھی اپنے پسندیدہ راستے پر چلا دیا جائے اور وقت ضرورت قتل گاہ میں لے جا کر انکے سر و بدن کو علیحدہ کر کے اپنے تخت، مسند کو استحکام بخشا جائے۔ پھر اس پر بیٹھ کر اکڑا جائے اور دوسروں کو آنکھیں دکھائی جائیں۔ٹھیک اسی طرح جس طرح حجاج بن یوسف اور اسکے جیسے حکام کا حال تھا۔ یہ لوگ، عقلی دنیا میں ابھی انسانی زندگی کی اہمیت اور خدا سے رابطے کی عظمت کو نہیں سمجھ پائے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ انسانیت کے معنی نہیں سمجھے ہیں یا سمجھنا نہیں چاہتے بلکہ دین کو بھی ایک ظاہری اور تکلفاتی آداب و رسوم سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ ان کے گمان میں دنیا کی زمام حکومت کو حاصل کرنے کے لئے پوپ انوسان سوئم کی طرح کسی بھی طرح کے انسانی یا غیر انسانی اقدام سے گریز نہیں کرنا چاہئے۔

ان کا یہ دھوکا یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ سب سے بڑی غفلت آمیز اور نقصان دہ فکر اس وقت پیدا ہوئی جب انہوں نے رسول اسلامؐ کے سلسلے میں بعض عام قسم کی سطحی کتابوں کا سرسری مطالعہ کر کے یہ لکھ دیا:

"اسلامی لشکر ایک مختصر سی مدت میں فلاں فلاں جنگ میں کامیاب ہوا اور بعض ممالک کو زیر کر لیا۔"

جبکہ اس کے برخلاف وہ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ اس عالم اسلام کی وسیع و عریض سرزمین پر جناب ابوذر غفاریؓ جیسے کتنے افراد پیدا ہو سکے؟ کیا خود پیغمبر اکرمؐ اس مختصر سے عرصے میں تمام اسلامی احکام کو ہر مسلمان کے دل و جان میں (بجز چند مسلمان) اتار سکے؟ وہ سب کہتے تھے کہ آپ پر ایمان لے آئے ہیں جبکہ خداوند متعال انکے اس اظہار ایمان کو جھٹلا رہا تھا اور اپنے نبیؐ سے یہ فرما رہا تھا: "ہرگز انکے ظاہری کلمات پر بھروسہ نہ کیجئے گا، ابھی انکے دلوں میں ایمان راسخ نہیں ہوا ہے۔ وہ سب ظاہری طور پر مسلمان ہوئے ہیں اور بس۔" کیا یہ ممکن ہے کہ اس طرح کے عربوں کے نیرنگ و حیلے کو رسالت پناہ کی سادہ لوحی قرار دیا جائے یعنی کیا یہ کہا جا سکتا ہے چونکہ پیغمبر اکرمؐ پوری طرح سے لوگوں کے درمیان رسوخ پیدا نہ کر سکے لہذا وہ اچھے سیاستداں نہیں تھے؟ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ جو کہ دنیا کے تمام مذاہب کے رئیس ہیں، اچھے سیاستداں نہیں تھے کیونکہ انکے زمانے میں خود انکے خاندان والے انکے اطاعت گزار نہ تھے۔ یقیناً اس قسم کا تصور فقط ایک واہمہ ہے، اس کے علاوہ

کچھ نہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ عصر پیغمبرؐ میں اسلام پوری طرح سے عالم شباب پر تھا اور اس دور کے مسلمانوں میں مکمل طور پر حرارت ایمانی پائی جاتی تھی لیکن یہ بھی تلخ حقیقت ہے کہ آنحضرت کے بعد ایسی باد خزاں چلی کہ جس نے اسلام کے سرسبز باغ کو ویرانہ بنا دیا اور ایسا سرد و یخ زدہ ماحول پیدا ہوا جس سے پورے ماحول پر ایک قسم کا جمود ساطاری ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ ظلم و ستم کی ایسی بجلی گری جس نے پورے اسلام کے آشیانے کو جلا کر خاکستر کر دیا اور پھر اسکے بعد ہر طرف ریاست طلبی و شہوت پرستی کا ایسا بازار گرم ہوا جس کے بیان سے قلم لرزتا ہے۔ ان سب کے باوجود کیا یہ حضرت علیؑ کی سیاست کا طرۂ امتیاز نہ تھا کہ ایسے پرآشوب ماحول میں بھی کچھ اس طرح اپنی شخصیت کو ثابت کیا کہ کچھ ہی عرصے بعد مختصر سے پیروکاروں کا گروہ، کروڑوں جانثار و عاشق افراد میں تبدیل ہو گیا۔ یہاں پر جو چیز سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے، اس کی طرف اشپنیگلو نے یوں توجہ دلائی ہے:

> ''ایک باغباں کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ بیج بو کر اسکی پرورش و اصلاح کرے۔ اسی طرح وہ چاہے تو پودے درخت بننے سے پہلے ہی خشک ہو کر ضائع ہو جائیں۔ اسکے اندر یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ ایسی فضا مہیا کرے جو پھل و پھول کی پوشیدہ خاصیتوں اور اسکی شکل و رنگت پر مؤثر ہو۔ یہ سب کام اور اس طرح کے تمام خصوصیات کی و بیشی کے اعتبار سے باغباں کی بصیرت اور سمجھ بوجھ پر منحصر ہوتے ہیں لیکن اصل شکل و صورت، اسکا مستقبل، اسکا رشد، پھل کی قسم وغیرہ باغبان کے دست قدرت سے خارج ہیں بلکہ یہ سب اس درخت کی طبیعت میں شامل ہیں۔''

اگر شہوت پرست اور مخالف دین افراد یہ نہ چاہیں کہ آئین انسانیت کو سمجھ کر اسکی روشنی میں زندگی گزاریں تو ایک سیاستداں کی غلطی کیا ہو سکتی ہے؟ اگر کوئی حیوان صفت انسان فقط مال و دولت اور جاہ و مقام ہی کو انسانی اقدار شمار کرے تو ایک سیاسی رہبر کیا کر سکتا ہے جبکہ وہ عظیم شخص عوام الناس کی ثروت کا محافظ ہونے اور حساب و کتاب میں پوری توجہ سے کام لینے کی وجہ سے ہر شخص کو اسی مقدار میں بیت المال سے عطا

کرے جس مقدار میں اسکی سماجی خدمات کا تقاضا ہو۔

کیا کسی کوتاہ نظر کو حضرت علیؑ کے وہ دستور العمل، جو آپ نے مالک اشتر کو حاکم مصر بنا کر بھیجتے وقت بیان فرمائے تھے اور جو آپ کی سیاست کا شاہکار سمجھے جاتے ہیں، کے علاوہ بھی کسی اور دلیل کی ضرورت ہے۔

وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ اچھے سیاستداں نہیں تھے، ان کا مقصود نظر ہمارے لئے پوری طرح واضح ہے، وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ان کے مطابق حضرت علیؑ کے بارے میں یہ کہنا تو ٹھیک ہے کہ آپ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وزیر تھے اور عمرو بن عبد ود اور مرحب جیسے شقی القلب و خونریز دشمنوں کے مقابلے میں ڈٹے رہے لیکن آپ کی سیاست کے بارے میں بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے سیاسی میدان میں (العیاذ باللہ) احتیاط سے کام نہیں لیا کیوں کہ آپ منجی بشریت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کو بچانے کے لئے آنحضرت کے بستر پر سو گئے۔ اگر دشمن کامیاب ہو جاتے اور شمشیریں آپ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتیں تو آپ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ ان کے بقول یہ بات سیاست کے خلاف ہے کہ قدرت وطاقت اور جانثاروں کے باوجود حضرت علیؑ نے اپنا حق حاصل کرنے کے لئے قیام نہیں کیا۔ لوگوں کا کیا ہے وہ تو آخر کار یا کفر اختیار کرتے یا پھر ایمان پر باقی رہتے۔ اس کی کیا اہمیت ہے؟ اسلام کی حفاظت نیز مسلمانوں کے جہالت کی طرف پلٹ جانے کے خوف سے حضرت علیؑ کا خانہ نشیں ہو جانا، (نعوذ باللہ) آپ کی غیر سیاسی بصیرت کا نتیجہ تھا۔ ان لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ یہ سادہ لوحی ہے کہ انسان حصول ریاست کی خاطر طاقتور اشخاص سے دست وگریباں ہو جائے اور نتیجے میں اپنی کمزوری کو سب پر ثابت کردے۔ حضرت علیؑ کے لئے یہ ضروری تھا کہ معاویہ جیسے خونخوار و سفاک کو اس کے منصب پر باقی رکھتے کیونکہ چند سالوں کے لئے ظلم برداشت کر لینے اور اسلامی جاہ وجلال کو گروی رکھ دینے سے کسی قسم کا نقصان نہیں ہوتا۔ ان افراد کے مطابق یہ حضرت علیؑ کی بے احتیاطی تھی کہ آپ نے اپنے جانی دشمنوں کو نہر سے پانی لینے کی اجازت دے دی اور کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی۔ اگر آپ سیاستداں ہوتے تو ہزاروں انسانوں بلکہ خدا کے بندوں کو پیاس سے ہلاک کر دیتے تا کہ آپ کی حکومت کا میدان ہموار ہو جاتا۔

ان لوگوں کے بقول: چونکہ علیؑ مداحوں کی تعریف اور چاپلوسی سے بیزار تھے اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ

وہ (العیاذ باللہ) سیاست میں مہارت نہیں رکھتے تھے کیونکہ آپ فرماتے تھے کہ جو نیک کام میں نے انجام دیا ہو اسکی تعریف نہ کرو کیونکہ اس کام کو میں نے فریضہ سمجھ کر کیا ہے اور فریضہ و ذمہ داری پر مدح و تعریف کا کیا تصور؟ مجھ سے اس طرح کی باتیں نہ کیا کرو جس طرح کی باتیں ایک پہلوان سے کی جاتی ہیں، چاپلوسی نہ کرو۔ ان لوگوں کی نگاہ میں چاپلوسوں پر مال و دولت لٹا دینا ہی سیاست ہے!

ہم ان سے کچھ نہیں کہنا چاہتے لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ ان لوگوں سے ایک دھوکا ہو گیا ہے، ان سب نے جناب ابراہیمؑ کے بجائے چنگیز خان اور جناب عیسیٰؑ کی جگہ اند و بخت النصر کو اپنا رہبر بنا لیا ہے۔

ہاں! ایک سیاستداں معاویہ بھی ہے۔ اگر اس کی سیاست سے آشنائی چاہتے ہوں تو اس دستور کو پڑھیں جو اس نے سفیان بن عوف غامدی کے لئے جاری کیا تھا۔ شرح نہج البلاغہ (ابن ابی الحدید۔ جلد اول صفحہ ۱۶) کی اس عبارت کو ملاحظہ فرمائیے:

> سفیان بن عوف غامدی کہتا ہے: ''معاویہ نے مجھے بلایا اور کہا کہ تم کو ایک عظیم لشکر کے ہمراہ بھیج رہا ہوں، فرات کے کنارے سے ہوتے ہوئے ''ہیت'' پہنچو۔ اس پر قبضہ کرو۔ اگر اہل قریہ مخالفت کریں تو ان سب پر حملہ کر کے جان و مال کو غارت کر دینا، پھر ہیت سے آگے بڑھ جانا اور ''انبار'' پہنچ کر بھی یہی کام کرنا، اگر وہاں فوج نہ ملے تو وہاں سے بھی آگے بڑھ جانا اور مدائن پہنچ جانا لیکن ہرگز کوفے کے قریب نہ جانا۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ اگر تم نے انبار و مدائن کے ساکنین کو اچھی طرح خوفزدہ کر لیا تو گویا تم نے کوفے پر دباؤ بڑھا لیا۔ اے سفیان! اس قسم کی غارت گری عراقیوں کے دل میں وحشت پیدا کر دے گی۔ اس طرح ہمارے دوستوں کے دل شاد ہوں گے نیز ان سب کاموں سے ڈر جانے والے، ہماری طرف مائل ہو جائیں گے۔ ایسے وقت میں وہ افراد جو تمہاری رائے سے متفق نہ ہوں ان کو قتل کر دینا۔ راستے میں جو بھی آبادی ملے اسے تباہ و برباد کر دینا، وہاں کے اموال کا مصادرہ

کر لینا کیونکہ مال و ثروت کی لوٹ مار، عمومی قتل کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے اثرات بھی زیادہ ہوتے ہیں۔''

یہ تھا ایک ''بڑے سیاست باز'' کا حکم جو ایک ایسے اسلامی معاشرے میں تھا جہاں کے انسانوں کی اہمیت بلکہ ایک حقیر چیونٹی کی وقعت بھی پوری دنیا سے زیادہ تھی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ چنگیز خان کا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا، افسوس کہ وہ کچھ دیر سے دنیا میں آیا، کاش! معاویہ کے زمانے میں ہوتا تا کہ اس کے سیاسی نظریات کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر کے بیٹھتا اور سیاست کے آئین سیکھتا۔

ہاں! صحیح ہے بعض باتیں سیاست سے دور ہیں۔ جب دشمن صف آرا ہو کے سامنے آ چکا ہو اور حملہ کرنے کے لئے آمادگی کر رہا ہو تا کہ تشنگی سے یا پانی میں ڈبو کر دشمنوں کو ہلاک کر دے۔ ایسے وقت میں حضرت علی علیہ السلام خدا کی بارگاہ میں ہاتھ بلند کرتے ہوئے دعا فرماتے ہیں:

''خدایا! لوگوں کے قلوب تیری طرف راغب ہیں، گردنیں جھکی ہوئی ہیں اور آنکھیں تیری ذات سے امیدیں لگائے ہوئے ہیں اور ہر گروہ کی دلی کدورت و عداوت ظاہر ہو چکی ہے، کینہ توزی کا بازار گرم ہے، خداوندا! پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیبت، دشمنوں کی کثرت اور نظریات کی پراکندگی کے لئے تجھ سے شکایت کرتا ہوں۔ پروردگارا! ہمیں ہمارے دشمنوں پر حقیقی فتح عنایت فرما، تو ہی بہترین فتح عطا کرنے والا ہے۔''

(نہج البلاغہ ج/۲/ص/۱۰۲)

یا جنگ شروع ہونے سے قبل اپنے لشکر کو یہ حکم دیتے ہیں:

''خبردار! اس وقت تک جنگ شروع نہ کرنا جب تک وہ لوگ پہل نہ کر دیں کہ تم بحمد اللہ اپنی دلیل رکھتے ہو اور انہیں اس وقت تک موقع نہ دینا جب تک پہل نہ کر دیں کہ یہ ایک دوسری حجت ہو جائیگی۔ اس کے بعد جب حکم خدا سے دشمن کو شکست ہو جائے تو کسی بھاگنے والے کو قتل نہ کرنا اور کسی عاجز کو ہلاک نہ کرنا نیز کسی زخمی پر قاتلانہ حملہ نہ کرنا اور خواتین کو اذیت مت دینا چاہے وہ تمہیں گالیاں ہی

کیوں نہ دیں اور تمہارے حکام کو برا بھلا ہی کیوں نہ کہیں۔"

(نہج البلاغہ مکتوب/۱۴، ج/۳ص/۱۶)

کہا جاتا ہے کہ تیسری تعریف میں ذکر ہونے والا ایک عام سیاستداں جب مقام عمل میں قدم رکھتا ہے تو اپنے اور معاشرہ کے درمیان موجود رابطے کے سلسلے میں دھوکا کھا جاتا ہے کیونکہ شروع میں تو خود کو سماج کا خدمت گزار سمجھتا ہے لیکن میدان عمل میں اُترتے ہی معاشرہ کو اپنا خادم سمجھ لیتا ہے۔ فقط حالی موالی ہوتے ہیں جنہیں اسکی مصاحبت سے فائدہ پہنچتا ہے۔

اس سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام کے نظریئے کو بھی معلوم کرنا ضروری ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"انی اریدکم للّٰہ وانتم تریدونی لا نفسکم"

"میں تم لوگوں کو خدا کے لئے چاہتا ہوں اور تم لوگ مجھے اپنے لئے چاہتے ہو" اس مختصر سے جملہ کے ذریعے حضرت علی علیہ السلام کی شناخت اور ان کے بیانات کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے۔

تاریخ میں ایسے شواہد مل جائیں گے جن کے مطابق متعدد سیاسی رہبروں نے ہر طرح کی ذمہ داری سے خود کو آزاد کر کے لوگوں کو اپنا زر خرید غلام تصور کر لیا تھا یہی نہیں بلکہ پورے پورے علاقوں کو تاراج بھی کر دیا تو کوئی اف تک کرنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ اس طرح وہ لوگ اپنی مطلق العنان سیاست کا رنگ دکھاتے تھے لیکن حضرت علیؑ فرماتے ہیں: الا وانی اقاتل رجلین رجل ادعی مالیس له، رجل منع الذی علیه (میں دو لوگوں سے ہمیشہ نبرد آزمائی کروں گا: ایک وہ جو ایسی صفت کا دعویٰ کرے جو ان میں نہیں پائی جاتی، دوسرا وہ شخص جو اپنے حق کو ادا کرنے سے انکار کر دے۔ (نہج البلاغہ ج/۲ص/۱۰۵) اب ایسے اشخاص طلحہ و زبیر ہوں کہ سردار قوم کہلائیں یا عرب کا ایک عام باشندہ ہو، البتہ ایسی صورت میں طلحہ و زبیر اگر ہوں تو جنگ جمل برپا کر دیں گے کیونکہ بعض لوگوں کی نگاہ میں یہ سیاست کے خلاف کام ہے اس لئے جنگ ہونا ہی چاہئے۔

یہیں پر میں حضرت علیؑ کے اس جملہ کو بھی لکھنا چاہوں گا: "ایھا الناس انما انا رجل منکم لی مالکم وعلی ماعلیکم" (نہج البلاغہ ج۲ص ۵۸)

(لوگو! میں تمہاری ہی طرح ایک مسلمان ہوں لہذا ہر وہ چیز جو تمہارے لئے مفید ہو میرے لئے بھی مفید ہے اور جو نقصاندہ ہو وہ میرے حق میں بھی نقصاندہ ہے۔)

یہاں پر یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ سیاست کے اس معنی ''عوام پر حکومت'' ان دنیاوی سیاستدانوں سے بہت دور ہے کیونکہ تاریخ کے آئینے میں ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ ستاروں اور کہکشاؤں کو بھی رام کر لیتے اگر چہ اس سے ان کو فائدے کے بجائے نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑتا۔

اب میں اپنی اس گفتگو کو اس شخصیت کے ایک جملے سے مکمل کرتا ہوں جو حقیقی اور بے مثال سیاستداں ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا کے ہر میدان میں کامیاب دکھائی دیتا ہے:

> ''ہم ایسے زمانے میں زندگی گزار رہے ہیں جہاں اکثر افراد مکر و فریب کو ہوشیاری سمجھتے ہیں اور نادان لوگ اس قسم کے حیلوں کو راہ حل سمجھتے ہیں۔ ان کا عذر کیا ہے؟ خدا ان کو ہلاک کرے، ایک حقیقی رہبر ان تمام دھوکوں کو بخوبی سمجھتا ہے لیکن خود بھی اسے اختیار نہیں کرتا کیونکہ خدا کا حکم اس کے قدم روک دیتا ہے۔ اسی احساس کے تحت وہ دھوکہ دھڑی کی راہ پر نہیں چلتا لیکن جس کو دین کا درد نہ ہو وہ ایسے کاموں میں پوری طرح ڈوب جاتا ہے۔''
>
> (نہج البلاغہ ج ا ص ۸۸)

ایک اور جگہ آپ فرماتے ہیں: ''اگر خدا کا تقوی نہ ہوتا تو میں انسانوں (یا ایک نسخے کے مطابق عربوں) میں سب سے بڑا سیاستداں ہوتا'' (لو لا التقی لکنت ادھی الناس) یہی چیز آپ کی پوری زندگی میں نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے جس کے مطالعہ سے تمام باتیں روشن ہو جائیں گی۔ ہم فقط بعض نمونے پیش کرتے ہیں:

(ا)۔ اکثر تاریخوں میں ملتا ہے کہ جب خلافت کی رسہ کشی چل رہی تھی اس وقت جو پیشین گوئی آپؑ نے فرمائی وہ پوری طرح صحیح ثابت ہوئی۔ مثال کے طور پر جب خلیفہ دوم آپ سے خلیفہ اول کے ہاتھ پر بیعت کا اصرار کر رہے تھے تو آپ نے فرمایا: ''اس کے لئے دودھ دوہو یقیناً تھوڑا بہت بعد میں تمہیں بھی مل

جائے گا''اس سلسلے میں کسی مورخ نے اختلاف نہیں کیا ہے کہ خلیفہ دوم کی خلافت صرف خلیفہ اول کی تائید سے ہوئی تھی ورنہ اس کے سلسلے میں کسی قسم کی شوریٰ یا انتخاب کا چکر نہیں تھا۔

(۲)۔اسی طرح جب جنگ صفین میں پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق نیزوں پر قرآن کو بلند کیا گیا اور آپ نے اس کو دیکھا نیز ان کے نعرے''لاحکم الا للہ'' کو سنا تو فرمایا:''یہ ایک کلمۂ حق ہے مگر اس سے باطل معنی مراد لئے جا رہے ہیں''۔یہاں پر کوئی بھی مورخ ایسا نہیں ملے گا جو یہ کہے کہ اس جملے کو بیان کرنے سے قبل آپ نے پہلے لشکر کے سپہ سالاروں سے تبادلہ خیال کیا ہو پھر یہ کلمات کہے ہوں بلکہ سب نے لکھا کہ جیسے ہی اس منظر کو آپ نے دیکھا اسی وقت یہ جملہ ارشاد فرمایا تھا۔

(۳)۔طلحہ وزبیر کے واقعہ کو بھی غور سے دیکھیں۔ان دونوں نے آکر کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ مکّے جا کر عمرہ کریں تو آپ نے فرمایا:''تمہاری نیت میں حج یا عمرہ نہیں بلکہ حیلہ وفریب ہے۔''

اس کے علاوہ ہزاروں مواقع پر حضرت علیؑ نے پیشین گوئی فرمائی تھی جو بعد میں پوری طرح صحیح ثابت ہوئی۔

ہماری اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت علیؑ سیاست کے اس حقیقی معنی ومراد سے بخوبی واقف تھے جس کی آرزو ہر فرزند آدم کرتا ہے نیز اس پر عمل پیرا بھی تھے۔اسی طرح سیاست کے دوسرے غلط معنی کو بھی جانتے اور سمجھتے تھے جس سے مراد، مقصد معین کر کے ہر وسیلہ سے اس تک پہنچنا ہے لیکن چونکہ یہ انسانوں کے لئے نقصان دہ ہے اس وجہ سے آپ نے اسے اختیار نہیں فرمایا۔

ترجمہ : سید محمد حسن نقوی

علیؑ

اور

جہاد

مسئلہ جہاد جو اپنے ہمراہ خونریزی، بے رحمی اور بربریت کا مہیب تصور لیکر آتا ہے، اسلام کے اہم ترین مسائل میں سے ایک ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ اس قول کی کہ اسلام شمشیر کے زور پر پھیلا ہے حتی الامکان توجیہ وتفسیر کی جائے۔ اس مسئلے کی وضاحت کے لئے ضروری ہے کہ اس سماج کا بہ نظر غائر ایک جائزہ لیا جائے جس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے تبلیغی سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس سلسلے میں کچھ مطالب بیان کئے جائینگے اور کوشش کی جائے گی کہ ایسے مصادر اور منابع سے استفادہ کیا جائے جو مسلم اور غیر مسلم دونوں مورخین کیلئے متفق علیہ ہوں یعنی جب تک کسی ایک امر کی وضاحت کے لئے متفق علیہ مصادر پیش نہیں کئے جائینگے، انکے ذریعے استناد سے اجتناب کیا جائے گا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلی مرتبہ وحی نازل ہونے کے بعد اپنی رسالت کے اظہار کے لئے اقدامات شروع فرمائے۔ ابتدا میں آپ نے اپنی رسالت کے اظہار کے لئے ایک بہت ہی مختصر اور

محدود دائرے کا انتخاب فرمایا۔ آپکے مؤثر اقدامات اور حقیقی پیغامات کے نتیجے میں مردوں میں سب سے پہلے حضرت علیؑ اور خواتین میں اسلام کی طرف سب سے پہلے سبقت کرنے والی حضرت خدیجہ تھیں۔

ایک عرصے تک آپ نے اپنی نبوت کو اپنے اقرباء کے درمیان پوشیدہ رکھا۔ بتدریج آپکی رسالت کو وسعت بخشی جاتی رہی یہاں تک کہ پیغام آیا کہ اپنے اعمام کو (جنکا شمار اشراف قریش میں کیا جاتا تھا) جمع کرو اور اپنی رسالت کو انکے سامنے بیان کرو۔ آپ نے اپنے چچاؤں اور انکی اولاد کو جمع کیا اور انکے سامنے اپنے مبعوث برسالت ہونے کو بیان کیا جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ انہوں نے آپ کی صدا پر لبیک نہیں کہا بلکہ آپ کو انکی روگردانی اور اعتراضات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام اعتراضات سے قطع نظر کرتے ہوئے بغیر کسی قسم کی یاس و ناامیدی کے اپنے پیغام کو دوسرے افراد تک پہونچانا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ بت پرستی اور زمانہ جاہلیت کے عرب کے درمیان رائج فاسد رسم ورواج اور ناروا عادات کے سلسلے میں آپکی مخالفت زباں زد عام وخاص ہوگئی۔ مختلف حادثات و واقعات رونما ہوتے رہے لیکن پیغمبر اسلامؐ کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔ آپکے اس تبلیغی مشن اور محکم ارادوں کے سامنے قریش بے دست و پا ہو گئے اور اس افتاد ناگہانی سے نجات پانے کے لئے انہوں نے چھوٹے بڑے گروہ تشکیل دینا شروع کر دئے۔

آپ کے اس تبلیغی دور کے دوران اشراف قریش کے نمائندے کبھی مال ومتاع کی لالچ دے کر تو کبھی مصائب وآلام سے ڈرا دھمکا کر آپکی آواز کو دبانے اور آپ کو آپکے بلند و بالا مقاصد سے باز رکھنے کی سعی لاحاصل کرتے رہے۔ انہیں اقدمات میں سے بعنوان نمونہ، ایک کا ذکر اس جگہ پر مناسب ہے۔

قریش کی خواهش

ایک روز عتبہ بن ربیعہ جو عرب کے سربرآوردہ افراد میں سے تھا، قریش کے مجمع میں بیٹھا ہوا تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں تنہا تھے۔ عتبہ نے رؤسائے قریش سے کہا: ''میں محمدؐ کے پاس جا رہا ہوں، ان سے گفتگو کروں گا اور ان مسائل کے سلسلے میں انکے سامنے کچھ چیزوں کی پیش کش کروں گا، شاید

کسی کو قبول کرلیں۔ وہ جس چیز کے خواہش مند ہوں گے ہم ان کے لئے مہیا کردینگے۔ شاید مال ومنال اور قدرت واختیار تک رسائی انکے بلند حوصلوں کو پست اور انکی ثابت قدمی کو متزلزل کردے۔'' (یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب جناب حمزہؓ ایمان لا چکے تھے اور آپکے پیروکاروں کی تعداد روز افزوں تھی) قریش کے سرداروں نے اسکی تائید کی اور اسکو حضرت سے گفتگو کرنے کی اجازت دے دی۔ عتبہ مسجد میں آکر پیغمبر اسلامؐ کے نزدیک بیٹھ گیا اور کہنے لگا: ''اے میرے بھتیجے! جیسا کہ تم جانتے ہو کہ تمہارا مقام ومنزلت تمہارے قبیلے کی عظمت وشرافت کی وجہ سے ہے۔ تم نے اپنی قوم کے بہت ہی حساس مسئلے کو چھیڑا ہے، اس کے اتحاد کو درہم برہم کردیا ہے، اسکی خواہشات اور آرزوؤں کو حماقت سے تعبیر کرتے ہو، اسکے خداؤں اور مذہب پر عیب لگاتے ہوئے اسکے آباؤ اجداد کو کافر قرار دیتے ہو۔ میں تمہارے سامنے بعض چیزوں کی پیش کش کرتا ہوں ان پر غور کرو شاید ان میں سے کچھ یا تمام اس لائق ہوں کہ ان کو قبول کرلو۔''

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابوالولید! کہو میں سن رہا ہوں۔''

عتبہ نے کہا: ''میرے بھتیجے! اگر تمہاری ان تمام حرکات کا مقصد مال وثروت اکٹھا کرنا ہے تو ہم تم کو اتنی دولت دینے کے لئے آمادہ ہیں کہ تم سب سے زیادہ ثروت مند ہو جاؤ، اگر مقام ومنزلت کے خواہشمند ہو تو ہم تم کو اپنا سردار بنانے کے لئے تیار ہیں، اگر حکومت چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنا بادشاہ تسلیم کرلیں گے اور اگر تم اپنی اس حالت کو جو تم پر طاری ہوتی ہے اپنے سے دور کرنے سے عاجز ہو تو تمہارے لئے طبیب کا انتظام کرسکتے ہیں، تمہیں اس مرض سے نجات دلانے کے لئے ہم اپنی دولت خرچ کردینگے۔ بعض اوقات انسان پر ایسی حالت طاری ہوسکتی ہے لیکن اسکے معالجے کا امکان ہے''۔ جب عتبہ اپنی بات مکمل کرچکا اور پیغمبر اسلامؐ اسکی تمام گفتگو سن چکے تو فرمایا: ''اے عتبہ! تمہاری بات ختم ہوگئی۔ اس نے کہا: ''ہاں'' پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اب مجھ سے سنو۔'' اسنے کہا: ''میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآناً عَرَبِيّاً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ ☆ بَشِيْراً وَنَذِيْراً فَأَعْرَضَ أَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ☆ وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِيْ أَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَا إِلَيْهِ (فصلت/۳-۵) پھر اسکے بعد کی آیات عتبہ کے سامنے تلاوت فرمائیں۔ (جب پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

آیات کی تلاوت فرمارہے تھے، عتبہ بے خودی کے عالم میں آیات کو سن رہا تھا) یہاں تک کہ جب آیۂ سجدہ پر پہنچے تو وہیں سجدہ ادا کیا، پھر فرمایا: ''اے ابوالولید! تم نے سنا؟ اب تم خود ہی فیصلہ کرو۔'' عتبہ واپس پلٹ گیا۔ جیسے ہی قریش نے عتبہ کو پلٹتے دیکھا، ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ عتبہ ایک دوسری حالت میں واپس ہو رہا ہے۔

عتبہ آکر قریش کے درمیان بیٹھ گیا۔ قریش نے بے چینی سے سوال کیا: ''عتبہ تم نے کیا دیکھا؟''۔ عتبہ کہنے لگا'' خدا کی قسم! آج ایسا کلام سنا ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ بخدا وہ کلام نہ شعر ہے اور نہ سحر و جادو۔ اے سرداران قریش! اس مرد کے بارے میں میری بات مانو اور اسکا معاملہ میرے سپرد کر دو۔ میرا نظریہ ہے کہ اس شخص کو اسکے حال پر چھوڑ کر کنارہ کش ہو جاؤ۔ خدا کی قسم! میں نے آج جو کلام اس سے سنا ہے وہ مستقبل کے کسی بہت بڑے حادثے کا پیش خیمہ ہے۔ اگر عرب نے اسکا کام تمام کر دیا تو تم بغیر کسی اقدام کے اس مشکل سے نجات پا جاؤ گے اور اگر یہ شخص عرب پر مسلط ہو گیا تو اسکی منزلت اور قدرت و اقتدار تمہاری عظمت اور اقتدار کا وسیلہ بن جائیگی۔ اسکی بنا پر تم تمام عرب سے زیادہ خوش بخت ہو جاؤ گے۔'' قریش نے اسکی گفتگو سن کر کہا: '' خدا کی قسم! اسنے تم پر بھی جادو کر دیا ہے۔'' عتبہ نے کہا: '' یہ میرا نظریہ تھا ورنہ تم خود صاحب اختیار ہو۔''

ردِّ عمل

جب قریش اپنی آمد و رفت اور وعدہ وعید سے مایوس ہو گئے تو انکے پاس مسلمانوں پر ظلم ڈھانے اور ان کو نیست و نابود کرنے کی کوششوں کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ بچا۔ چنانچہ عرب کے تمام قبیلے اپنے قبیلے کے ان افراد کو جو اسلام لے آئے تھے، گرفتار کر کے قید و بند میں مبتلا کر دیتے تھے اور ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتے تھے۔ انکو مارتے پیٹتے، بھوک اور پیاس کے ذریعے تمام راہیں ان پر مسدود کر دیتے تھے۔ جب مکہ کی سنگلاخ وادی پر آفتاب شعلہ افشانی کر رہا ہوتا تھا ان مسلمانوں پر انہیں سلگتے ہوئے پتھروں اور تپتی ہوئی ریت میں عذاب ڈھایا جاتا تھا۔

جوں جوں مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا تھا ان پر مصائب و آلام بھی کبھی فردی اور کبھی

اجتماعی طور پر بڑھتے چلے جاتے تھے۔ آخر کار پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مجبوراً بعض مسلمانوں کو حبشہ ہجرت کرنے کا حکم دینا پڑا تا کہ انکو قریش کے مظالم سے نجات دلائی جا سکے۔ ان مسلمانوں کو حبشہ کے لئے رخصت کرتے وقت آپ نے فرمایا: ''حبشہ میں ایک عادل بادشاہ کی حکومت ہے۔ وہاں تم پر ستم نہیں ہوگا۔''

قریش اس صورت حال پر ساکت نہیں بیٹھے بلکہ دو لوگوں کو عرب کے نمائندے کی حیثیت سے حبشہ روانہ کیا گیا کہ مسلمانوں کو واپس لیکر آئیں تا کہ قریش انکو دین اسلام سے منحرف کر سکیں۔ جب نمائندگان عرب حبشہ کے بادشاہ کے پاس پہنچے اور مسلمانوں کی بازیابی کی درخواست کی تو نجاشی نے کہا: ''میرے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ لوگ میری سرزمین پر کیوں وارد ہوئے ہیں؟'' کچھ مسلمانوں کو حاضر کیا گیا۔ انہوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپکے اس دین کے بارے میں جس نے انسانوں کو سعادت ابدی سے ہمکنار کرنے کا وعدہ کیا تھا، بیان کیا۔ نجاشی نے کہا کہ میں ان لوگوں کو پلٹنے کا حکم نہیں دونگا بلکہ یہ اس سلسلے میں مختار ہیں۔

اسکے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دین کو عرب کے قبائل کے سامنے پیش کرنا شروع کیا۔ خصوصاً حج کے موسم میں منیٰ میں قیام پذیر حاجیوں کی جائے قیام پر پہونچ کر توحید کی تبلیغ فرماتے اور ان لوگوں کو شرک اور بت پرستی سے اجتناب کی جانب دعوت دیتے تھے۔ وہ قبائل جن کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کی دعوت دی، مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) بنی کلب (۲) بنی حنیفہ (۳) بنی عامر (۴) بنی خزرج

دعوت جہاد

یہ بات مسلم ہے کہ تمام تاریخیں اس بات پر متفق ہیں کہ بیعت عقبہ (ہجرت سے دو تین سال قبل) تک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی جانب سے ذرہ برابر بھی جنگی ارادے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اسلام کے اندر روز بروز استحکام اور پختگی نے آہستہ آہستہ قریش کو بے حد پریشان کر دیا جسکے نتیجے میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ نوبت جنگ تک پہونچ گئی۔ تاریخ نے اس صورت حال کو اس

طرح بیان کیا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بیعت عقبہ سے پہلے تک جنگ کی اجازت نہیں حاصل ہوئی تھی۔ بیعت عقبہ تک آپ نے صبر وشکیبائی کو اپنا شعار اور لوگوں کے لئے دعاؤں کو اپنا وظیفہ قرار دیا تھا۔ دوسری جانب قریش نے مسلمانوں کو نیست ونابود کرنے اور مظالم ڈھانے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا۔ انہوں نے بعض مسلمانوں کو انکے دین سے برگشتہ کر دیا تھا، بعض کو جلاوطن اور بعض کو مصائب وآلام میں مبتلا کر رکھا تھا۔ یہاں تک کہ جنگ کے سلسلے میں پہلی آیت نازل ہوئی:

"أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ☆ الَّذِيْنَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ" (سورۂ حج/۳۹۔۴۰)

(جن لوگوں سے مسلسل جنگ کی جا رہی ہے انھیں ان کی مظلومیت کی بنا پر جہاد کی اجازت دیدی گئی ہے اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر قدرت رکھنے والا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے بلا کسی حق کے نکال دیئے گئے ہیں۔)

پھر دوسری آیت نازل ہوئی:

"وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ"

(انکے ساتھ جنگ کرو (تاکہ مسلمانوں کو انکے دین سے نہ پلٹائیں) یا تاکہ فساد کا خاتمہ ہو جائے۔)

ان امور کی جانب توجہ کرنے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ رہنمائے اسلام نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے جنگ کا سہارا نہیں لیا بلکہ جنگ کی بنیاد ڈالنے والے کفار ومشرکین ہیں۔ اس موقع پر پیغمبر اسلامؐ اپنا اور اپنے ساتھیوں کا دفاع کرنے پر مجبور تھے۔ چنانچہ پہلی بار جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ کے سلسلے میں اقدام فرمایا تو حملہ نہیں کیا بلکہ صرف اور صرف دفاع کیا۔ اگر اسلام کی تمام جنگوں کا بہ نظر غائر جائزہ لیا جائے تو ہر جگہ دفاعی جہتیں ہی نظر آتی ہیں حتیٰ کہ یہود ونصاریٰ کی پیمان شکنی کے موقع پر بھی چونکہ اس بات کا خوف تھا کہ وہ اسلام کے خلاف علم جنگ بلند کر دیں گے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حملے میں ابتدا فرمائی ہے۔ اسلام کے تمام جہادوں کی تحقیق کے لئے ضروری ہے کہ ان آیات کا مطالعہ کیا جائے

جو جہاد کے سلسلے میں نازل ہوئی ہیں۔ لہٰذا یہاں پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں واقع ہونے والے جہادوں سے متعلق نازل ہونے والی آیات کو بطور اختصار پیش کیا جارہا ہے۔

(۱)۔"أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ☆ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ "(سورہ حج/۳۹۔۴۰)

(جن لوگوں سے مسلسل جنگ کی جارہی ہے انھیں ان کی مظلومیت کی بنا پر جہاد کی اجازت دیدی گئی ہے اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر قدرت رکھنے والا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے بلا کسی حق کے نکال دیئے گئے ہیں علاوہ اس کے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے اور اگر خدا بعض لوگوں کو بعض کے ذریعے نہ روکتا ہوتا تو تمام گرجے اور یہودیوں کے عبادت خانے اور مسیحیوں کے عبادت خانے اور مسجدیں سب منہدم کردی جاتیں اور اللہ اپنے مددگاروں کی یقیناً مدد کرے گا کہ وہ یقیناً صاحب قوت بھی ہے اور صاحب عزت بھی ہے۔)

(۲)۔"وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ"

(انکے ساتھ جنگ کرو تا کہ مسلمانوں کو انکے دین سے نہ پلٹائیں یا تا کہ فساد کا خاتمہ ہوجائے۔)

(۳)۔"إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَى إِخْرَاجِكُمْ ...."(ممتحنہ/۹)

(وہ تمہیں صرف ان لوگوں سے روکتا ہے جنھوں نے تم سے دین میں جنگ کی ہے اور تمہیں وطن سے نکال باہر کیا ہے اور تمہارے نکالنے پر دشمنوں کی مدد کی ہے کہ ان سے دوستی کرو اور جو ان سے دوستی کرے گا وہ یقیناً ظالم ہوگا۔)

(۴)۔"كَيْفَ وَإِن يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً يُرْضُونَكُم بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَىٰ قُلُوبُهُمْ وَأَكْثَرُهُمْ فَاسِقُونَ ☆ اشْتَرَوْا بِآيَاتِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَصَدُّوا عَن سَبِيلِهِ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ☆ لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُونَ ☆ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ وَنُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ☆

وَإِن نَّكَثُوا أَيْمَانَهُم مِّن بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوا فِي دِينِكُمْ فَقَاتِلُوا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنتَهُونَ☆ أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُم بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ أَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَوْهُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ''(توبہ/۸۔۱۳)

(ان کے ساتھ کس طرح رعایت کی جائے جب کہ یہ تم پر غالب آجائیں تو نہ کسی ہمسائیگی اور قرابت کا لحاظ کریں گے اور نہ کوئی عہد و پیمان دیکھیں گے۔ یہ تو صرف زبانی تم کو خوش کر رہے ہیں ورنہ انکا دل قطعی منکر ہے اور ان کی اکثریت فاسق اور بدعہد ہے۔ انہوں نے آیات الٰہیہ کے بدلے بہت تھوڑی منفعت کو لے لیا ہے اور اب راہ خدا سے روک رہے ہیں۔ یہ بہت برا کام کر رہے ہیں۔ یہ کسی مومن کے بارے میں کسی قرابت یا قول و قرار کی پرواہ نہیں کرتے ہیں۔ یہ صرف زیادتی کرنے والے لوگ ہیں۔ پھر بھی اگر یہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو دین میں تمہارے بھائی ہیں اور ہم صاحبان علم کے لئے اپنی آیات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے رہتے ہیں اور اگر یہ عہد کے بعد بھی اپنی قسموں کو توڑ دیں اور دین میں طعنہ زنی کریں تو کفر کے سربراہوں سے کھل کر جہاد کرو کہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں ہے شاید یہ اسی طرح اپنی حرکتوں سے باز آجائیں۔ کیا تم اس قوم سے جہاد نہ کرو گے جس نے اپنے عہد و پیمان کو توڑ دیا اور رسول کو وطن سے نکال دینے کا ارادہ بھی کرلیا ہے اور تمہارے مقابلے میں مظالم کی پہل بھی کی ہے۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو تو خدا زیادہ حق دار ہے کہ اس کا خوف پیدا کرو اگر تم صاحب ایمان ہو۔)

(۵)۔ ''وَأَذَانٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ أَنَّ اللَّهَ بَرِيءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ وَرَسُولُهُ فَإِن تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ وَبَشِّرِ الَّذِينَ كَفَرُوا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ☆إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ☆فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ''(توبہ۳۔۴۔۵)

(اور اللہ ورسول کی طرف سے حج اکبر کے دن انسانوں کے لئے اعلان عام ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ دونوں مشرکین سے بیزار ہیں لہذا اگر تم توبہ کرلو گے تو تمہارے حق میں بہتر ہے اور اگر انحراف کیا تو یاد رکھنا کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے ہو اور پیغمبر آپ کافروں کو دردناک عذاب کی بشارت دے دیجئے۔ علاوہ ان افراد کہ جن سے تم مسلمانوں نے معاہدہ کر رکھا ہے اور انھوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی ہے اور تمہارے خلاف ایک دوسرے کی مدد نہیں کی ہے تو چار مہینے کے بجائے جو مدت طے کی ہے اس وقت تک عہد کو پورا کرو کہ خدا تقویٰ اختیار کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ پھر جب یہ محترم مہینے گزر جائیں تو کفار کو جہاں پاؤ قتل کردو اور گرفت میں لے لو اور قید کر دو اور ہر راستہ اور گزرگاہ پر ان کے لئے بیٹھ جاؤ اور راستہ تنگ کردو۔ پھر اگر توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو کہ خدا بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔)

(۶)۔" وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَآفَّةً "(توبہ/۳۶)

(اور تمام مشرکین سے اسی طرح جہاد کرو جس طرح وہ تم سے جنگ کرتے ہیں۔)

(۷)۔" وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ☆ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُم مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّىٰ يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِن قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِيْنَ ☆ فَإِنِ انتَهَوْا فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ☆ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَإِنِ انتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِيْنَ "

(بقرۃ/۱۹۰۔۱۹۱۔۱۹۲۔۱۹۳)

(جو لوگ تم سے جنگ کرتے ہیں تم بھی ان سے راہ خدا میں جہاد کرو اور زیادتی نہ کرو کہ خدا زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کردو اور جس طرح انہوں نے تم کو آوارہ وطن کردیا ہے تم بھی انہیں نکال باہر کردو اور فتنہ پردازی تو قتل سے بھی بدتر ہے اور ان سے مسجد الحرام کے پاس اس وقت تک جنگ نہ کرو جب تک وہ تم سے جنگ نہ کریں۔ اس کے بعد جنگ چھیڑ دیں تو تم بھی چپ نہ بیٹھو اور جنگ کرو کہ یہی کافرین کی سزا ہے۔ پھر اگر جنگ سے بعض آجائیں تو خدا بخشنے والا اور مہربان ہے

اور ان سے اس وقت تک جنگ جاری رکھو جب تک سارا فتنہ ختم نہ ہو جائے اور دین صرف اللہ کا نہ رہ جائے پھر اگر وہ لوگ باز آ جائیں تو ظالمین کے علاوہ کسی پر زیادتی جائز نہیں ہے۔)

(۸)۔"وَدَّ كَثِيرٌ مِنْ اهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِنْ بَعْدِ ايْمَانِكُمْ كُفَّارًا" (بقرۃ/۱۰۹)

(بہت سے اہل کتاب یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں بھی ایمان کے بعد کافر بنالیں۔)

مذکورہ آیات اسلام میں جہاد کی اہمیت کو واضح اور اس کے مفہوم کو روشن کرسکتی ہیں۔ان آیات کا اکثر حصہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے پیروکاروں کو اپنا اور حریم اسلامی کا دفاع کرنے پر مامور کرنے کیلئے خداوند عالم کی جانب سے نازل کیا گیا ہے۔آخر الذکر آیت، اہل کتاب کے مسلمانوں کے ساتھ برتاؤ کی وضاحت کر رہی ہے کہ یہ لوگ اسلام کے ارتقاء کے لئے سدراہ ہیں، حتی کہ مسلمانوں کو انکے منتخبہ راستے سے دگرگوں کرنے کے لئے سعی وکوشش میں مصروف ہیں۔سورہ توبہ کی بعض آیات جن کو نقل کیا گیا ہے، واضح طور پر بیان کر رہی ہیں کہ پیمان کے ختم ہونے کے بعد مشرکین کے ساتھ کوئی رورعایت نہ کرو اور انکے ساتھ جنگ کا آغاز کردو۔

مذکورہ آیات اور اسی قسم کی دوسری آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اسلام نے مشرکین کے لئے صرف دو راہوں کا انتخاب کیا ہے، ایک اسلام اور دوسرے جنگ لیکن مرسوم ادیان کے پیروکاروں کو ایک تیسری راہ کی بھی پیش کش کی ہے اور وہ ہے جزیہ (ٹیکس) دیکر اسلامی حکومت کی پناہ میں زندگی بسر کرنا۔

اسلامی حکومت

اسلام میں شمشیر کشی اور جہاد کا مسئلہ چند اعتبار سے قابل غور ہے:

(۱)۔ اسلام کی نظر میں مشرکین کے لئے دو راستوں کے علاوہ تیسرا راستہ موجود نہیں ہے۔

(۲)۔ رائج ادیان کے پیروکاروں کو جو صاحب کتاب تھے اور خود کو سابقہ الٰہی پیشواؤں کا پیرو سمجھتے تھے، اسلام نے فقط اپنی حکومت اور سرپرستی قبول کروانے کے بعد انکے مذہبی عقائد کے سلسلے میں آزاد چھوڑ دیا تھا۔

(۳)۔ اسلام اپنی حکومت کو تمام قوموں اور ملتوں پر مسلط کرنا چاہتا تھا۔

(۴)۔ جنگ کے سلسلے میں اسلام کی راہ و روش کیا تھی؟

(۵)۔ مسئلہ جزیہ (ٹیکس) کی کیا نوعیت تھی؟

(۶)۔ آیا اسلام کی نشو و نما اور ارتقاء میں شمشیر اور خونریزی دخیل تھی؟

(۷)۔ آیا حکومت اسلامی کا دائرہ، جنگ اور خونریزی کے ذریعہ وسیع کیا گیا ہے؟

(۱)۔اسلام نے مشرکین کیلئے صرف دو راستوں کا انتخاب کیا تھا

فقہ اسلامی اور معتبر تاریخی شواہد سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اسلام نے مشرکین کو دو راہوں میں سے کسی ایک کے منتخب کر لینے کا اختیار دیا تھا کہ یا اسلام کو قبول کر لیں یا دوسرا اور آخری راستہ یہ تھا کہ آمادۂ جنگ ہو جائیں۔

انسانی فطرت اور نفسیات کے دقیق مطالعے کے بعد یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ صانع عالم کا وجود اور اسکی یکتائی ایک عمیق اور دقیق ترین مسئلہ ہے جسکو معمولی انسانوں کی نفسیات میں خاصا دخل ہے حتی کہ منکرانِ الوہیت بھی نادانستہ اور اجمالی طور پر یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اگر ایسی کسی ذات کا اس کائنات میں وجود ہو تو وہ باعظمت ترین ذات اور یہ نظریہ عظیم ترین نظریہ ہوگا۔ دوسری طرف یہی انسان جب مقام پرستش میں آتا ہے تو خدا کی ذات کے اتنے عظیم تصور کے باوجود اسکی منزلت کو اتنا گرا دیتا ہے کہ دست انسانی کے ذریعے تراشے گئے ایک پتھر کو اس کا شریک اور جاگزیں بنا دیتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ ایک بے جان پتھر یا ایک جامد مادہ طبیعی تغیرات کے سامنے بے دست و پا اور سراپا تسلیم محض ہے اور کسی قسم کا شعور واحساس نہیں رکھتا ہے۔ یہ نہ صرف خدا کی بزرگ و بالا ذات کی توہین ہے بلکہ اسمیں دنیائے بشریت کی بھی اہانت مضمر ہے۔

ایسا انسان جو اپنے مقدس ترین اور بزرگترین جذبے اور تصور کو (جو کہ مقام والائے خداوندی ہے) اس حد تک پستی میں پہونچا دے کہ اپنے ہی ہاتھوں سے تراشے ہوئے پتھروں کے سامنے سر نیاز خم کر دے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ اسکے نزدیک کسی بھی بزرگ اور باعظمت مفہوم کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسی بنیاد پر اسلام نے مشرکین سے جنگ کو اختیار کیا ورنہ اگر مشرکین بھی خود کو اہل کتاب اور انہیں کی طرح خداوند عالم کی عظیم ذات کا معترف اور معتقد قرار دیتے تو انکے ساتھ بھی اہل کتاب والا سلوک روا رکھا جاتا یعنی وہ بھی دیگر خارجی گروہوں کی طرح جزیہ (ٹیکس) ادا کر کے اسلام کی عادلانہ حکومت کے زیر سایہ زندگی بسر کر سکتے تھے۔

(۲)۔ آسمانی ادیان کے صاحبان کتاب پیروکار صرف اسلامی حکومت کو قبول کرنے پر مجبور تھے

فقہ اسلامی اور تاریخ کے متفقہ فیصلہ کی مد: یہ بات پائے ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے دیگر ادیان کے تابعین پر اسلامی عقائد نافذ کرنے کے لئے ہر قسم کے جبر و زبردستی سے اجتناب کیا ہے بلکہ اسکے برخلاف انکے عقائد کو محترم جانا ہے۔ آپکی روش یہ تھی کہ صرف انکے فاسد اور منحرف عقائد پر اعتراض فرماتے تھے۔ جیسا کہ اس آیت میں بیان کیا گیا ہے:

"قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْاْ إِلَى كَلَمَةٍ سَوَاء بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلاَّ نَعْبُدَ إِلاَّ اللّهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَلاَ يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ فَإِن تَوَلَّوْاْ فَقُولُواْ اشْهَدُواْ بِأَنَّا مُسْلِمُون "(آل عمران ۶۴)

(اے پیغمبر آپ کہہ دیں کہ اے اہل کتاب آؤ ایک منصفانہ کلمہ پر اتفاق کرلیں کہ خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں آپس میں ایک دوسرے کو خدائی کا درجہ نہ دیں اور اس کے بعد بھی یہ لوگ منہ موڑیں تو کہہ دیجیے کہ تم لوگ بھی گواہ رہنا کہ ہم لوگ حقیقی مسلمان اور اطاعت گزار ہیں۔)

سابقہ الٰہی ادیان کے پیروکار اسلامی تحریک کے مقابلے میں تین امور میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر مجبور تھے:

(۱)۔ قبولیت اسلام

(۲)۔ حکومت اسلامی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اور اپنی فردی اور اجتماعی زندگی کی حفاظت کیلئے جزیہ وغیرہ ادا کرنا۔

(۳)۔ جنگ: جیسا کہ آئندہ ذکر ہوگا کہ یہ جنگیں اپنے عقائد کو منوانے کیلئے نہیں تھیں بلکہ اسلام کی عادلانہ حکومت کو قبول کرانے کے لئے تھیں۔

(۳)۔ حکومت اسلامی کو تمام اقوام وملل پر تسلط پیدا کرنے کی کیا وجہ تھی؟

شاید یہ مسئلہ ہماری بحث کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ یقیناً یہ کہا جاسکتا ہے کہ قطعی دلیلیں اور واضح براہین، اسلام کی مستحکم اور عدالت خواہ حکومت کو ثابت کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں احکام اسلامی اور اسلام کے حقیقی حکام کی راہ وروش اور طرز حکومت سے استدلال کیا جائیگا۔

اولاً اسلام نے جہاں تک انسانی فطرت کا مطالعہ اور اسکی طبیعت وجبلت کے بارے میں مکمل طور پر تحقیق کی ہے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اسلام میں حکومت اور حاکمیت کا تصور ایک حساس ترین مسئلہ ہے جس کی اساس یہ ہے کہ انسان کو سعادت اور خوش بختی کی جانب حتی الامکان رہنمائی اور اس کو سعادت ابدی سے ہمکنار کرنے کی آخری مرحلے تک سعی وکوشش کی جائے۔

حکومت اور حاکیت کا مسئلہ ایسا مسئلہ نہیں ہے جس سے سرسری طور پر گزرا جاسکے یا اپنی تسلی خاطر کے لئے خوبصورت اور ادبی اسلوب بیان میں عمدہ عبارتوں میں بیان کردیا جائے۔ بغیر کسی جھجک اور پردہ پوشی کے یہ بات کہی جانا چاہئے کہ ہر حاکم اور ہر حکمراں بلکہ ہر اجتماعی اور مذہبی مکتب کی اہمیت اور حیثیت کا اندازہ انسان (جو ہر مکتب اور مذہب کی تمام کارکردگیوں کا محور اور اساس ہے) کے سلسلہ میں اسکی راہ وروش اور طرز تحقیق وتبیین سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہی طرز تفکر اور طریقہ تحقیق وشناخت اس مکتب کی حقیقی حیثیت کا کاشف ہوسکتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فطرت انسانی اور بشری نفسیات کی بطور کامل شناخت اور اسکی منطقی طور پر تحقیق کی ہے۔ اس بات کی تصدیق دو طریقوں سے کی جاسکتی ہے:

(۱)۔ وہ اصول جن کو قرآن (اسلامی آئین) نے انسان کے سلسلے میں بیان فرمایا ہے جنکو ان مباحث کے مقدمہ میں مفصل بیان کیا جاچکا ہے اور اس بحث میں بھی اجمالی طور پر اشارہ کیا جائے گا۔

(۲)۔ ان افراد کی گواہی جو اسلام کے بارے میں اطلاعات رکھتے ہیں۔ علاوہ برایں، انسان کے سلسلے میں خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپکے ساتھیوں کی راہ وروش بھی قابل استفادہ ہے۔

انسان کے سلسلے میں قرآن کریم میں جو اصول ونظریات بیان کئے گئے ہیں وہ کسی ایک پہلو کی نشاندہی نہیں کرتے بلکہ اسکی مختلف جہات سے تشریح کرتے ہیں۔

(۱)۔انسان سعادت وشقاوت کے اعتبار سے ایک ثابت موجود نہیں ہے بلکہ تغیرات پذیری اسکا خاصہ ہے۔

(۲)۔انسان کے اندر مذکورہ دونوں صفات غیر محدود طور پر جلوہ گر ہوسکتی ہیں۔جب سعادت اور خوش بختی کی مقدس اور پاکیزہ صفات اسکے اندر جلوہ نمائی شروع کرتی ہیں تو وہ خدا کی عظیم اور مافوق کائنات، ذات کے صفات کا مظہر بن جاتا ہے۔جیسے ابراہیمؑ خلیل خدا، موسیٰؑ بن عمران، عیسیٰؑ بن مریم، محمدؐ بن عبداللہ اور علی بن ابی طالبؑ اور جب یہی انسان شقاوت اور پستی کی منازل میں وارد ہوتا ہے تو پست ترین حد تک گرسکتا ہے جسکی کوئی انتہا نہیں ہے جیسے فراعین وستمگاران بنی اسرائیل وابن ملجم وفرعون اور اسی طرح بیشمار افراد۔

(۳)۔ان دونوں صفات میں سے کوئی بھی صفت، انسانی توانائی اور اسکے اختیارات کے حدود کی تعیین کیے بغیر قابل حل نہیں ہے۔

(۴)۔اصل طبعیت انسان ایک باعظمت گوہر کی حیثیت رکھتی ہے جو لامتناہی صعود اور تنزل کو تحمل کرنیکی صلاحیت رکھتا ہے۔

(۵)۔انسان اپنے مادی پیکر اور حبِ ذات کی بنیاد پر خود غرض اور مفاد پرست واقع ہوا ہے۔اگر ایمان ایک خارجی مانع کی حیثیت سے اسکے روبرو نہ ہو تو وہ ایک ایسا خود خواہ اور منافع پرست مخلوق ہے جسکے مقابلے میں دنیا کی تمام مخلوقات ہیچ ہیں۔

(۶)۔اگر ان طبیعی عوارض سے جو اس کو فساد کی جانب لے جاتے ہیں، قطع نظر کرتے ہوئے فیصلہ کیا جائے تو اس موجود کی حیثیت اور قیمت دیگر تمام حیثیتوں اور قیمتوں کے مقابلہ کہیں زیادہ بلکہ مافوق حیثیت واہمیت ہے۔

کسی بھی اجتماعی، سیاسی یا فلسفی مکتب نے انسان کی اس فطرت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے نظریات بیان نہیں کیے ہیں کیونکہ ابھی تک مختلف مکاتب فکر انسان کے بارے میں اس کی تمام جہات کو مدنظر رکھتے ہوئے اظہار نظر نہیں کرسکے ہیں اور اگر اتفاقاً کوئی ایسا مکتب فکر جس نے انسان کے سلسلے میں اسکی تمام جہات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے نظریات بیان کیے ہوں، معرض وجود میں آیا بھی ہے تو اسلام کا موافق و مدافع ہی رہا ہے اور اپنے ان ہمہ جہات نظریات کی بنیاد پر اپنی ابدیت کا ضامن بن گیا ہے۔اسلام نے

دوبارہ انسان کی انسانیت سے قطع نظر کرتے ہوئے زندگی اور روح کو مورد تحقیق قرار دیا ہے۔ اسلام وسیع پیمانے اور غیر محدود طور پر حیوانات کو جاندار ہونے کی بنیاد پر مورد تحقیق قرار دیتا ہے اور انکے بارے میں اس طرح ارشاد فرماتا ہے:

''کسی بھی زندہ موجود سے بغیر کسی معقول سبب کے اسکی زندگی کو سلب نہیں کیا جا سکتا خواہ وہ حیوان قابل استفادہ بھی نہ ہو۔''

یہاں پر حیوان کے حقوق کے سلسلے میں اجمالی طور پر بعض اسلامی نظریات کو بیان کیا جارہا ہے:

(۱)۔ ہر شخص جس کے پاس کوئی حیوان ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس حیوان کے لئے اسکے حسب حال تمام وسائل زندگی فراہم کرے۔ اگر اسکے امکان میں نہ ہو یا نہ چاہتا ہو کہ ان وسائل کو مہیا کرے تو اگر اس حیوان کا گوشت قابل استفادہ ہو تو اسکو ذبح کر کے اسکے گوشت سے استفادہ کر سکتا ہے اور اگر یہ بھی اسکے امکان میں نہ ہو یا حیوان کا گوشت قابل استفادہ نہ ہو تو اسکو چاہئے کہ اس حیوان کو فروخت کر دے یا کرائے پر دیدے تا کہ اسکی زندگی کے وسائل فراہم ہو سکیں اور اگر ان تمام راہوں میں سے کوئی بھی اسکے اختیار میں نہ ہو یا ان پر عمل درآمد کرنا نہ چاہتا ہو تو اسے چاہئے کہ اس حیوان کو آزاد کر دے تا کہ وہ اپنی زندگی کے لئے وسائل فراہم کر سکے۔

(۲)۔ اگر اس شخص نے جسکے زیر نظر کوئی حیوان ہے، مذکورہ امور میں سے کسی کو انجام نہ دیا ہو تو حاکم شرع کو حق حاصل ہے کہ وہ اس حیوان اور اسکے مالک کے حسب حال، مالک کو مذکورہ امور میں سے کسی ایک پر مجبور کرے۔

(۳)۔ اگر مالک ان تمام امور کی انجام دہی سے اجتناب کرے تو اس صورت میں اس حیوان کے تمام اختیارات حاکم شرع کی جانب منتقل ہو جائیں گے۔ حاکم اسکے اموال منقولہ کو فروخت کر کے حیوان کی زندگی کے وسائل مہیا کر سکتا ہے حتی اگر مالک کے اموال غیر منقولہ پر تصرف کے علاوہ دوسرا کوئی چارہ باقی نہ رہ جائے تو بھی حاکم شرع اسکے اموال غیر منقولہ پر تصرف کر کے حیوان کے لئے وسائل زندگی مہیا کر سکتا ہے۔

(۴)۔ بچہ دار حیوان کے دودھ سے استفادہ کرنے کی اجازت دی گئی ہے لیکن اگر دودھ حاصل

کرنے کی بنا پر اس جانور کے بچہ کو کوئی گزند پہونچ جائے تو مالک کو مجرم سمجھا جائیگا۔

اگر دو جانور تشنگی کی بنیاد پر موت کے قریب ہوں اور انمیں سے ایک حلال گوشت اور دوسرا حرام گوشت حیوان ہو اور پانی کی موجودہ مقدار ان دونوں میں سے کسی ایک کو موت سے نجات دے سکتی ہو تو بعض فقہاء کے فتاوی کے مطابق پانی کے ذریعے حرام گوشت جانور (مثلاً کتا) کو زندگی بخشی جائیگی کیونکہ حلال گوشت کو ذبح کر کے اسکے گوشت سے استفادہ قانونی حیثیت رکھتا ہے لیکن کتے کا تشنگی کی بنیاد پر مرجانا غیر قانونی ہے۔

مذکورہ حقوقی قواعد کی علت فقہائے اسلامی یہ بیان فرماتے ہیں کہ یہ تمام حقوق اس بنا پر ہیں کہ حیوان ایک جاندار مخلوق ہے اور جاندار مخلوق کی زندگی کو بے قیمت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اگر حکومت اسلامی کے عادلانہ قوانین کی جاندار بالخصوص نوع انسانی کو مدنظر رکھتے ہوئے آخری حد تک شناخت حاصل کر لی جائے تو اسکے باقی قوانین و احکام کی حقیقت کی شناخت و تحقیق سے بے نیازی حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس طرح اسلام نے انسان کی شناخت کی ہے کسی دوسرے مکتب فکری کی رسائی اس مرتبہ تک نہیں ہوئی ہے جسکو دیگر مکاتب فکر کے غیر مسلم مورخین و محققین نے اپنے آثار میں ذکر کیا ہے۔

امریکا کا مشہور مورخ، ویل ڈورانٹ، مؤلف تاریخ تمدن، اس سلسلے میں یوں رقم طراز ہے:

''یہ بات بالکل واضح ہے کہ کسی بھی شخص نے پیغمبرؐ کے تعلیم یافتہ ہونے کو اہمیت نہیں دی ہے کیونکہ اس زمانہ میں لکھنا اور پڑھنا انسان کے امتیازات میں شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ اس بنا پر قبیلہ قریش میں صرف ۱۷ افراد ایسے تھے جو لکھ اور پڑھ سکتے تھے اور یہ بات پائے ثبوت کو نہیں پہونچی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے اپنے ہاتھوں سے کچھ لکھا ہو حتی کہ مبعوث بر رسالت ہونے کے بعد بھی ایک محرر آپکی خدمت میں رہتا تھا۔ اسکے باوجود بھی کہ آپکا علم حاصل نہ کرنا، آپکے ایک ایسی کتاب پیش کرنے کے سدراہ نہ ہو سکا جو عربی کی مشہور ترین و بلیغ ترین کتاب ہو اور اسی طرح انسان کی اسکے شایان

شان شناخت کر سکے کہ علمی لحاظ سے ترقی یافتہ اور بلند پایہ اشخاص بھی اسکی منزلت و عظمت تک رسائی حاصل نہ کر سکیں۔"

اس جگہ اسکا آخری جملہ قابل غور ہے، اس نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ "آپکی انسان شناسی تقریباً بے نظیر ہے" اسی مورخ کا ایک اور جملہ قابل ذکر ہے۔ مذکورہ کتاب کے صفحہ/ ۷۴ پر اس طرح رقمطراز ہے:

"اگر مفہوم عظمت اور ایک باعظمت انسان کے انسانی معاشروں پر اثر کے بارے میں اظہار خیال کیا جائے تو یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تاریخ کے عظیم ترین انسانوں سے زیادہ بافضیلت اور باعظمت ہیں۔ آپنے اپنی اس قوم کی روحانی اور اخلاقی سطح کو بلندی عطا کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا کہ جسکو جھلستے ہوئے ریگستان کی گرم ہواؤں اور بیابانوں کی بے کیف خشکی نے حیوانیت کی گھنگھور تاریکی میں ضم کر دیا تھا۔ آپ اپنے عزم میں اس حد تک کامیاب و کامران ہوئے کہ تاریخ بشریت کا کوئی بھی مصلح آپکے مقام تک نہ پہونچ سکا۔"

یہی مورخ اور مفکر مذکورہ کتاب کے صفحہ/ ۱۱۶ پر کہتا ہے کہ "اسلام، ادیان میں سادہ ترین اور روشن ترین دین ہے۔"

دوبارہ صفحہ/ ۱۵۱ پر یوں بیان کرتا ہے: "تعلیم و تربیت کے سلسلے میں اسلامی حکومتوں کی تائید سے چلائی جانے والی تحریکوں کی بدولت تعلیمات عام ہو گئیں اور علم و دانش کو زندگی مل گئی، ادبیات، فلسفہ اور دیگر فنون کو ارتقاء کی اتنی بلند منازل پر پہنچا دیا گیا کہ مغربی ایشیا ۵۰۰ رسال تک دنیا کے متمدن ترین ممالک میں شمار کیا جاتا تھا۔"

صفحہ/ ۱۶۵ پر لکھتا ہے: "یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کی عام راہ و روش ترقی کی آخری ممکنہ حدود تک رسائی حاصل کر چکی ہے۔"

صفحہ/ ۲۹۲ پر کہتا ہے: "اسپین کی تاریخ میں اسلامی حکومت سے زیادہ مہربان اور عادل حکومت وجود میں نہیں آئی ہے۔"

خلاصۂ کلام یہ کہ حکومت اسلامی نے اپنے منصفانہ اصول وقوانین کی بنیاد پر تمام معاشروں پر حکومت اور تسلط کا انتخاب کیا ہے۔

اسلامی حکومت میں شخصیت، حسب ونسب اور دیگر تمام مروجہ رسوم کو لغو اور بے حقیقت قرار دیا گیا ہے۔

ایک سیاہ فام مسلمان جسکے اندر حاکمیت کے شرائط پائے جا رہے ہوں، مملکت اسلامی پر حکومت کر سکتا ہے اسلئے کہ اسلام نے شخصیت کی اساس، پاکیزگی روح اور تقوے کو قرار دیا ہے۔ حکومت اسلامی کی راہ و روش، جسکا اثر اور نتیجہ مختلف معاشروں میں نظر آتا ہے، ایک تاریخی واقعے کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے جسکی مسلم اور غیر مسلم دونوں مورخین نے تصدیق کی ہے۔

حضرت عمر کے دور حکومت میں مسلمانوں کو اطلاع موصول ہوئی کہ شہنشاہ روم نے مسلمانوں سے جنگ کرنے کیلئے ایک عظیم لشکر ترتیب دیا ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کے لشکر نے شام کے ایک شہر ''حمص'' پر فتح حاصل کی تھی اور اسکے باشندوں سے معمول کے مطابق جزیہ لیا تھا۔ اس خبر کے موصول ہونے کے بعد ہی کہ شہنشاہ روم، حمص پر حملہ آور ہونے والا ہے، حمص کے باشندوں کو ان سے حاصل کیا ہوا تمام جزیہ واپس پلٹا دیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ ہم شہنشاہ روم کے مقابلے میں تمہاری محافظت کرنے سے معذور ہیں لہذا تم خود اپنی حفاظت کا بندوبست کرلو۔ اہل حمص نے جواب دیا کہ تمہاری (مسلمانوں کی) حاکمیت ہمارے لئے سابقہ حکومتوں کی بہ نسبت محبوب تر ہے۔ ہم گزشتہ حکومتوں کے دوران مظلوم اور بے بس تھے۔ اسی بنا پر قوم یہود نے پیش قدمی کرتے ہوئے کہا: ''توریت کی قسم! ہم تمہارے سپہ سالار کے شانہ بشانہ لشکر روم سے جنگ کرینگے یہاں تک کہ ہماری طاقت جواب دے جائے یا ہم مغلوب ہو جائیں۔'' چنانچہ قوم یہود نے شہر کے دروازوں کو بند کر دیا اور اسکی حفاظت کے لئے کوشاں ہوگئی۔

اسی طرح دوسرے شہروں میں مسلمانوں کے ساتھ صلح کرنے اور حکومت اسلامی کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے والے یہود و نصاری نے بھی اقدامات کئے۔ انکا خیال تھا کہ اگر شہنشاہ روم مسلمانوں پر غالب آگیا تو ہمیں ناچار اپنی سابقہ حالت کی طرف پلٹنا پڑے گا اور اگر شہنشاہ روم غالب نہ ہوسکا تو ہم مسلمانوں کے باقی ماندہ آخری فرد تک کا ساتھ دینگے۔ جب خداوند عالم نے مسلمانوں کو فاتح اور کفار روم کو مغلوب کر

دیا تو یہود و نصاریٰ نے شہروں کے دروازوں کو مسلمانوں کے لئے کھول دیا اور شادمانی و مسرت کے عالم میں ناچتے گاتے ہوئے مسلمانوں کا استقبال کیا اور دوبارہ جزیہ ادا کیا۔ (فتوح البلدان: ج/۱ص/۱۸۷)

اسی داستان کو جرجی زیدان نے تاریخ تمدن اسلامی: ج/۱ص/۲۸ پر نقل کیا ہے۔

یہی اسباب تھے کہ جنکی بنا پر اس قدیم زمانے میں جس میں علم و معرفت کے دروازے بند تھے اور انسانی اور طبیعی اصول و قوانین کو اس بے شعور سماج میں نافذ کردینا تقریباً ناممکن تھا، نافذ کردیا گیا۔ اکثر مسلم اور غیر مسلم مورخین اس بات کے معترف ہیں کہ اس دور کی مشکلات کے باوجود اسلام نے جہاں بھی قدم رکھا، اپنے طرز حکومت اور مختلف اقوام و ملل کو منطقی حدود میں بخشی گئی آزادی کی بنا پر، بہت تیزی کے ساتھ ترقی کی منزلوں کو طے کرتا چلا گیا۔

اس مقام پر ضرورت ہے اس بات کی کہ ایک ماہر سماجیات جسکی اس فن میں مہارت مشرقی و مغربی دونوں مورخین کے نزدیک ثابت ہو، کا نظریہ طلب کیا جائے اور ہماری نظر میں یہ شخص ڈاکٹر گوسٹا ولو بون (۱۸۴۱۔۱۹۳۱) ہے جسکی تالیفات ابھی تک سماجیات کے سلسلے میں عمیق ترین آثار میں شمار کی جاتی ہیں۔ اس عظیم محقق نے اسلامی حکومت اور اسکے ارتقاء کی تیز رفتاری کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

''خلفائے راشدین کی امور مملکت کے بارے میں حسن تدبیر کا حصہ، جنگی فنون اور سپاہ گری سے زیادہ تھا۔ بہت ہی مختصر مدت میں انہوں نے ان فنون میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ ابتدائے کار میں انکا سابقہ ایسی اقوام و ملل سے پڑا تھا جو سالہا سال ظالم حکام کے شکنجے میں رہ چکی تھیں۔ ان ظالم حاکموں نے ہر طرح کے ظلم و جور کو انکے لئے روا کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس مظلوم رعایا نے اسلامی حکمرانوں کی جدید حکومت کا تہہ دل سے استقبال کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سابقہ حکومتوں کے مقابلے اسلامی حکومت میں زیادہ آزادی اور امن و سکون نصیب ہوسکتا ہے۔ ان مغلوبہ اقوام کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا جائے؟ یہ بات مکمل طور پر روشن اور واضح ہو چکی تھی۔ خلفائے اسلام نے، بالخصوص حسن سیاست کے لحاظ سے مذہب کو تلوار کے زور پر پھیلانے

کی کوشش نہیں کی بلکہ ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ حتی الامکان دیانت اور عدالت کو معاشرہ میں رائج کرسکیں۔ چنانچہ جیسا کہ زباں زد عام و خاص ہے انکی طرف سے وقتاً فوقتاً اس بات کا اظہار ہوتا رہتا تھا کہ مغلوبہ اقوام کے تمام مذہبی رسوم و عقائد کو قابل احترام سمجھا جائے گا اور اس آزادی کے مقابلہ میں ان سے بہت مختصر مقدار میں جزیہ کے عنوان سے خراج لیا جاتا تھا جو سابقہ حکام کے مقابلے بہت کم تھا۔ مجاہدین اسلام اس سے پہلے کہ جنگ کا آغاز کریں سفیروں اور نمائندوں کے ذریعے صلح کی پیش کش کرتے تھے جیسا کہ ابوالمحاسن نے نقل کیا ہے کہ یہ شرائط اساسی طور پر وہی شرائط ہوتے تھے جنکی پیش کش ۷ھ میں عمرو عاص نے غزہ کے باشندوں سے کی تھی اور ایران و مصر کے ساتھ بھی اسی طرح کی شرائط باندھی جاتی تھیں۔ جس طرح کے شرائط مقرر کئے تھے ان شرائط کی عبارت مندرجہ ذیل طریقہ پر ہوا کرتی تھی:

''ہمارے حاکم نے ہم کو یہ حکم دیا ہے کہ اگر تم قانون اسلام کو قبول نہ کرو تو ہم تمہارے ساتھ جنگ کریں۔ پس ہماری صدا پر لبیک کہو، ہمارے بھائی بن جاؤ اور ہر قسم کے سود و منافع میں ہمارے شریک ہوجاؤ۔ جان لو کہ اس کے بعد ہماری جانب سے تمہیں کسی قسم کی اذیت و آزار نہیں پہونچے گا۔ اگر ہمارے شرائط تمہارے لئے قابل قبول نہیں ہیں تو جب تک زندہ ہو، سالانہ خراج (جزیہ) کے عنوان سے ایک مبلغ ہمیں ادا کرتے رہو۔ دوسری جانب اس خراج کے مقابلے ہم بھی عہد کرتے ہیں کہ جو بھی تم کو اذیت و آزار پہنچائے گا یا کسی بھی قسم کی دشمنی کا اظہار کرے گا، ہم اس سے جنگ کرینگے۔ جب ہم تمہارے ساتھ یہ قرارداد کریں گے تو کسی بھی موقع پر اسے توڑیں گے نہیں۔ اگر تم نے اس کو بھی قبول نہیں کیا تو ہمارے اور تمہارے درمیان صرف تلوار فیصلہ کرے گی۔ ہم جب تک حکم خدا کو جاری نہیں کردینگے

تمہارے ساتھ جنگ کرینگے۔"

عمروعاص نے تقریباً یہی برتاؤ اہل مصر کے ساتھ کیا تھا۔ اسنے انکے ساتھ قرارداد کی تھی کہ مذہب اور مذہبی مراسم کے اعتبار سے انکو مکمل طور سے آزادی دی جائیگی، قانون وعدالت کو غیر جانب داری سے انکے درمیان جاری کیا جائیگا، مالکیت کے اصولوں کے تحت آراضی واجناس انکے حقوق میں شمار کئے جائیں گے۔ ان سہولیات کے عوض قرارداد کی گئی کہ بادشاہان قسطنطنیہ جو خطیر رقم زبردستی ان سے لیتے تھے اسکے مقابلے ہر شخص سالانہ جزیہ کے عنوان سے ایک مختصر مبلغ جو تقریباً ۱۵ فرینک کے مساوی تھا، ادا کرے۔ ان اطراف میں بسنے والوں نے اس قرارداد کو اسقدر غنیمت سمجھا کہ فوراً اسکو قبول کر لیا اور مبلغِ صلح کے عنوان سے کچھ مال جمع کر کے ہتھیار ڈال دیئے۔ اسلامی حکومت کے عمال اپنے عہد و پیمان کے سلسلے میں اسقدر وفادار تھے کہ سابقہ حکمرانوں کے ظلم وستم کا شکار عوام کے ساتھ انہوں نے غیر معمولی شفقت اور محبت ومہربانی کا سلوک اختیار کیا کہ عوام بارضا ورغبت، دین اور زبان عرب کی جانب کھنچتے چلے آئے۔ ایسے نتائج تلوار کے زور پر حاصل نہیں کئے جاسکتے۔ چنانچہ عرب سے قبل مصر کو فتح کرنے والے افراد میں سے کوئی بھی ہرگز یہ کامیابی حاصل نہ کرسکا۔

فتوحات عرب کے سلسلے میں ایک نکتہ قابل غور ہے جو دیگر اقوام میں نہیں پایا جاتا ہے۔ دوسری اقوام کو اگر دیکھا جائے تو بربریوں کی طرح (جنہوں نے روم کو فتح کیا) یا ترک وغیرہ جنہوں نے عالمی حکومت کے قیام کے قصد کے ساتھ نمایاں فتوحات حاصل کیں، انمیں سے کوئی بھی اپنا تمدن اور تہذیب قائم نہ کرسکا بلکہ اکثر نے مغلوبہ اقوام کے احوال وکوائف سے حتی الامکان بہرہ برداری کی۔ اسکے برخلاف تاریخ اسلام نے ایک بہت مختصر مدت میں ایک نئے تمدن اور تہذیب کو نافذ کر دیا اور مفتوحہ ممالک کی اقوام کی بڑی تعداد کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اس جدید تمدن

کے تمام اجزاء حتی کہ اسکی زبان اور مذہب کو اختیار کرلیں۔"

(تمدن اسلام وغرب، چوتھا ایڈیشن صفحہ/ ۱۵۷۔۱۵۸۔۱۵۹)

اسی مفکر نے مذکورہ کتاب کے صفحہ نمبر ۱۴۵ اور ۱۴۸ / پر اسلامی حکومت کی ترقی کے اسباب وعلل پر اسطرح روشنی ڈالی ہے:

"ہم اگر ابتدائی مسلمانوں کی فتوحات کا بنظر غائر مطالعہ کریں اور انکی کامیابی کے اسباب وعلل پر غور کریں تو احساس ہوگا کہ وہ مذہب کے سلسلے میں مکمل طور پر آزادی بخشتے تھے۔"

اگر عیسائیوں نے اپنے فاتحین یعنی اعراب کے دین یہاں تک کہ زبان کو بھی اختیار کرلیا ہے تو اسکا حقیقی سبب یہی ہے کہ وہ سابقہ حکمرانوں کے ظلم وستم برداشت کر چکے تھے اور جدید حکام کو سابقہ کے مقابلے عادل اور منصف مزاج سمجھتے تھے۔ اسکے علاوہ انکا مذہب بھی انکے اپنے مذہب کے مقابلے سادہ اور حقیقت سے قریب تھا۔

تاریخ کے ذریعے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کسی بھی مذہب کو تلوار کے زور پر پھیلانا ناممکن ہے۔ جب نصاری نے اندلس کو مسلمانوں کے قبضہ سے چھین لیا تو اس مغلوب قوم نے مرنا تو قبول کرلیا لیکن مذہب کو تبدیل کرنا گوارا نہیں کیا۔ واقعاً بجائے اس کے کہ اسلام تلوار و نیزے کے زور پر پھیلا ہو در حقیقت تبلیغ وتقریر اور تشویق کی بنا پر آگے بڑھا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ ترک ومغل اقوام نے عرب کو مغلوب کرنے کے باوجود انکا دین قبول کیا اور ہندستان میں جو فقط عرب کی گزرگاہ واقع ہوا تھا، اسلام نے اس حد تک ترقی کی کہ حال حاضر میں تقریباً ۲۰ / کروڑ مسلمان اس ملک میں موجود ہیں اور مستقل روبہ افزائش ہیں۔ اس وقت ہزاروں عیسائی تمام وسائل وذرائع کے ساتھ وہاں مشغول تبلیغ ہیں لیکن معلوم نہیں ہے کہ انکو اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل ہوئی یا نہیں۔ چین میں بھی اسلام کی ترقی وبلندی قابل توجہ ہے۔ اسی کتاب کے دوسرے حصہ کے مطالعے کے بعد یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسلام نے وہاں کس حد تک اپنا رسوخ پیدا کیا ہے۔ چنانچہ اسوقت چین میں ۴ / کروڑ سے زیادہ مسلمان موجود ہیں درحالیکہ عرب نے اس زمین پر حملہ نہیں کیا حتی کہ ایک بالشت زمین بھی اپنے تصرف میں نہیں لایا ہے۔

کتاب تمدن اسلامی ج/ ا ص/ ۸۰۔۸۱ پر اسلامی حکومت کی کامیابی کے اسباب کی فہرست کے ذیل

میں جرجی زیدان اس طرح تحریر کرتا ہے:

"مذکورہ اوصاف کے لئے روم اور ایران سے اسلامی حکومت کی پناہ میں داخل ہونے والے افراد کیلئے ایک عظیم تاثر اور وہ نصیحتیں جو اسلامی افواج کے گوش گزار کی جاتی تھیں، حسب ذیل ہیں: "خیانت نہ کرنا، فریب دہی سے اجتناب کرنا، اسیر نہ کرنا، مثلہ نہ کرنا، بوڑھوں اور بچوں کو قتل نہ کرنا، کسی درخت کو نہ جلانا نہ گرانا، پھل دار درختوں کو نہ کاٹنا، بھیڑ، گائے، اور اونٹوں کو نہ مارنا مگر یہ کہ خدا کے لئے۔ اگر تم ایسے گروہ کے پاس سے گزرو جو کنارہ کش ہو چکا ہو اور عبادت گاہوں میں پناہ لئے ہوئے ہو، اس کو اس کے حال پر چھوڑ دینا۔"

اسلامی افواج کی محبت و مہربانی کی ایک اہم دلیل اس آشیانے کی داستان ہے جسکو کسی پرندے نے اسلامی لشکر کے سپہ سالار کے خیمہ پر بنایا تھا۔ (داستان اس طرح ہے کہ اسلامی افواج نے مصر کے ایک مقام ہمام (جو آج مصر کے شہروں میں شمار کیا جاتا ہے) میں پڑاؤ ڈالا تھا، کوچ کے موقع پر جب خیموں کو جمع کیا جا رہا تھا تو لوگوں نے دیکھا کہ سردار لشکر کے خیمے پر ایک پرندے نے گھاس پھونس اکٹھا کر کے آشیانہ بنالیا ہے۔ سردار لشکر کو اس قضیہ سے باخبر کیا گیا اس نے قضیہ سن کر حکم دیا کہ جب تک انڈوں سے بچے نکل کر پرواز نہ کر جائیں خیمے کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔)

اسلام کی فتح مندی اور کامیابی کے دیگر اسباب میں سے ایک برابری اور مساوات کا قائل ہونا بھی ہے۔ چھوٹے اور بڑے کو برابری کا درجہ دیا جانا اسلام کی کامیابی کا ضامن بن گیا۔ اس قانون مساوات کی روشن ترین دلیل غسان کے بادشاہ جلبہ بن ایہم کی داستان ہے جو حضرت عمر کے دور میں اسلام لایا تھا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ جلبہ اپنی پیادہ اور سوار فوج کی ہمراہی میں وارد مدینہ ہوا۔ اسکے سر پر بیش قیمت جواہر کا جڑاؤ تاج تھا، گھوڑوں کے گلے میں سونے کی زنجیریں آویزاں تھیں۔ مدینے کے باشندے اسکا جاہ و حشم دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے۔ اسکا یہ جاہ و حشم اسلامی حد جاری کئے جانے سے مانع نہ ہو سکا۔ یہ داستان اسطرح ہے کہ قبیلہ فزار کے ایک معمولی شخص نے جلبہ کے شاہانہ لباس پر اپنا پیر رکھ دیا۔ جلبہ نے اپنے جلال و عظمت کے زعم

میں اس فزاری شخص کے منہ پر ایسا ہاتھ مارا کہ اسکی ناک زخمی ہوگئی۔اس فزاری شخص نے حضرت عمر سے شکایت کی، حضرت عمر نے جبلہ کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور اس سے اسکی اس حرکت کے بارے میں سوال کیا۔جبلہ نے جواب دیا: ''اے امیر المومنین! یہ شخص چاہتا تھا کہ میرا لباس کھل جائے۔اگر مکہ کا احترام پیش نظر نہ ہوتا تو تلوار کا ایسا وار کرتا کہ اسکا سر دونوں آنکھوں کے درمیان سے شگافتہ ہو جاتا۔''

حضرت عمر نے کہا: ''تم نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا ہے لہذا یا تو اس شخص کو راضی کردو یا یہ مرد تم سے قصاص لے گا۔ میں حکم دیتا ہوں کہ وہ بھی اسی طرح تمہاری ناک پر ضرب لگائے جس طرح تم نے اسکو ضرب لگائی ہے۔'' جبلہ نے سوال کیا: ''یہ کیسے ممکن ہے؟ وہ ایک معمولی انسان ہے اور میں بادشاہ ہوں۔'' حضرت عمر نے کہا: ''اسلام تمہیں اور اسے برابر سمجھتا ہے۔تم کو اس پر صرف تقوی اور پاکدامنی کے ذریعے برتری حاصل ہوسکتی ہے۔'' حضرت عمر کے اس حکم کے مقابل جبلہ کو اسلامی حکومت سے فرار کے سوا اور کوئی راہ نظر نہ آئی۔چنانچہ قسطنطنیہ بھاگ گیا اور پھر کبھی عرب ممالک کی جانب نہ پلٹا۔

مذکورہ داستان کی شبیہ قبطی کی داستان بھی ہے جسکو عمرو عاص کے بیٹے نے مارا تھا۔یہ شخص حضرت عمر کے پاس گیا اور ان سے عمرو عاص کے بیٹے کی شکایت کی۔حضرت عمر نے ایک شخص کو بھیج کر عمرو عاص اور اس کے فرزند کو بلوایا اور قبطی کے ہاتھ میں تازیانہ دیکر عمرو عاص کے بیٹے کے ساتھ ساتھ عمرو عاص کو بھی مارنے کا حکم دیا۔عمرو عاص کے پوچھنے پر کہ میرے بیٹے نے اس شخص کو مارا ہے، میری کیا خطا ہے۔حضرت عمر نے جواب دیا کہ اے عمرو عاص! کب سے تم نے لوگوں کو اپنا غلام بنالیا ہے درحالیکہ اپنی ماں کی کوکھ سے آزاد دنیا میں آئے تھے۔

جن اصولوں نے اسلام کی ترقی کے اسباب مہیا کئے ہیں انمیں سے ایک مغلوبہ اقوام کو دی جانے والی آزادی بھی ہے۔عرب جب کسی ملک کو فتح کرتے تھے تو اسکے باشندوں کو انکے دین، عقائد، رسومات اور مدنی وقضائی احکام کے سلسلے میں آزاد چھوڑ دیتے تھے اور کسی قسم کا جبر وزبردستی انکے ساتھ روا نہیں رکھتے تھے۔انکا یہ رویہ مصر اور دیگر تمام ممالک کے ساتھ اسی طرح تھا۔

اسلامی حکومت کے عادلانہ اور منصفانہ ہونے پر اتنی کثرت سے شواہد موجود ہیں کہ اسلام میں جہاد

سے مختص ایک کتاب اسکی صلاحیت نہیں رکھتی کہ ان تمام شواہد کی تفصیلات اسمیں درج کی جاسکیں۔

۴۔اسلام میں جنگ کی کیفیت

اسلام میں انسان بلکہ تمام جانداروں کے سلسلے میں جو تجزیہ وتفسیر کی گئی ہے اور زندگی کی اہمیت کا جس طرح اسلام قائل ہے اسکی روشنی میں اسلام میں موضوع جنگ ایک دلچسپ شکل اختیار کرلیتا ہے۔اس موضوع کو مزید واضح وروشن کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان بلکہ عام زندگی کے بارے میں اسلام کی تفسیر وتجزیے پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔ہم جانتے ہیں کہ اسلام نے ایک انسان کے بے وجہ قتل کو تمام نوع بشر کے قتل کے مرادف قرار دیا ہے۔اس مقام پر اس کے علاوہ بھی چند نکتوں کی جانب اشارہ کیا جائے گا:

(۱)۔ان تمام اوصاف حمیدہ سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ جن کی بنا پر حضرت علی بن ابی طالبؑ کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اسلام کی اولین صف میں شمار کیا جاتا ہے،بغیر کسی شک وشبہ کے آپؑ پہلی صف کے مجاہد بھی ہیں۔تمام تاریخوں نے متفقہ طور پر لکھا ہے کہ آپؑ کو کسی ایک شخص یا دشمن کی پوری فوج کے مقابلے میں کبھی ڈر کر پیچھے ہٹتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔جنگ تبوک کے علاوہ اسلام کی تمام جنگی فتوحات آپؑ کی علمبرداری اور فداکاری کی بنیاد پر معرض وجود میں آئی ہیں۔

اسلام کے اسی اولین ردیف کے شہسوار کا ارشاد گرامی ہے:"والله لو اعطيت الاقاليم السبعة بما تحت افلاكها على ان اعصى الله فى نملة اسلبها جلب شعيرة ما فعلت."

(خدا کی قسم!اگر ہفت اقلیم ان چیزوں سمیت جو آسمانوں کے نیچے ہیں مجھے دیدیے جائیں کہ صرف اللہ کی اتنی معصیت کروں کہ میں چیونٹی سے جو کا ایک چھلکا چھین لوں تو کبھی ایسا نہ کروں گا۔)

اسلام نے علیؑ کی اس طرح تربیت کی ہے کہ ایک طرف آپ کے سامنے اس دنیا کی آخری قابل تصور عظیم ترین منفعت (پوری دنیا کی مالکیت) ہے اور دوسری طرف دنیا کی ضعیف ترین موجود چیونٹی کے منھ سے ایک جو کا چھلکا چھیننا جو اس کائنات کا ناقابل شمار اور بے قیمت ترین حادثہ ہے۔علیؑ دونوں کا مقابلہ کرنے کے بعد اس چھوٹی سی نافرمانی کو اس لامحدود لذت سے کہیں زیادہ خوف ناک سمجھتے ہیں اور اس چھوٹی

سی معصیت سے بچنے کے لئے اس عظیم منفعت کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ یہ ہے اسلام کا مجاہد، اسے کہتے ہیں اسلام کے لئے تلوار چلانے والا، یہ وہ جنگجو ہے جو مفسدین کے ساتھ برسر پیکار ہے، جنگ کر رہا ہے، اسلام کے لئے میدان کارزار میں کشتوں کے پشتے لگا رہا ہے درحالیکہ چیونٹی جو ایک زندہ مخلوق ہے، کے منھ سے ایک جو کے چھلکے کو بھی ظلم و ستم کے ساتھ چھیننا گوارا نہیں کرتا ہے۔

(۲)۔ اخلاق انسانی کا جو سلوک حضرت علی بن ابی طالبؑ نے اپنے قاتل ابن ملجم کے ساتھ اختیار کیا ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام میں شمشیر کشی کا مسئلہ زور آزمائی کے لئے نہیں تھا بلکہ اسکا اصل مقصد انسان سازی تھا۔ آپ نے اپنے فرزندوں سے فرمایا تھا کہ اگر ابن ملجم کو معاف کردو گے تو یہ تقویٰ سے زیادہ نزدیک ہے۔

(۳)۔ حضرت رسول گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تمام جنگوں کے موقع پر عام فرمان یہ ہوا کرتا تھا:

"سیروا باسم اللّٰہ وفی سبیل اللّٰہ وعلی ملۃرسول اللّٰہ لاتغدروا ولاتغلوا ولاتمثلوا ولاتقطعوا شجرۃ الاان تضطروا الیھا ولاتقتلوا شیخا فاتیا ولاصبیاولاامراۃ ولامتبتلا فی شاھق ولاتحرقوا النخل ولاتغرقوا بالماء ولاتعقروا من البھائم مما یؤکل لحمہ الا مالابد لکم" (خدا کا نام لیکر، اسکی مدد، اسکی راہ میں پیغمبر خدا کی ملت پر آگے بڑھو۔ جنگ کے موقع پر فریب نہ کرنا، کسی کو اسیر نہ کرنا، مثلہ نہ کرنا، کسی درخت کو مجبوری کے موقع کے علاوہ قطع نہ کرنا، کسی چوپائے کو کہ جسکا گوشت قابل استفادہ ہو، نہ مارنا سوائے اس کے کہ کوئی دوسری راہ موجود نہ ہو۔) یہ اسلام کا جنگ کے سلسلے میں محکم دستور ہے۔ یہ نکتہ قابل غور ہے کہ آپ فرماتے ہیں کہ خدا کے نام سے، خدا کی مدد سے، خدا کی راہ میں، کسی مقام پر یہ نہیں کہا ہے کہ تلوار کے نام سے، کامیابی کی راہ میں۔ کبھی نہیں فرمایا کہ عرب کے نام سے، عرب کے تعاون سے، عرب کی سربلندی کے راستے میں۔ کہیں پر یہ ارشاد نہیں ہوا کہ حسب ونسب کے نام پر، نسلوں کے تعاون سے، نسلوں کی کامیابی کے لئے وغیرہ غیرہ۔

آپ فرماتے ہیں کہ فریب دہی، قید و بند میں مبتلا کرنا، مثلہ کرنا ممنوع ہے جب کہ معمولی انسانوں کے نزدیک یہ تمام چیزیں جنگ کا جزء لاینفک ہیں صرف اتنا ہی نہیں کہ انسان کو شمشیر کی نوک پر رکھنے سے منع فرمایا ہے بلکہ حکم یہ ہے کہ بلاوجہ حیوانات کے لئے اذیت و زحمت کا سبب نہ بننا۔

ان تمام چیزوں سے بڑا لازم الاجراء حکم دیا جارہا ہے کہ کسی بھی درخت کو بغیر مجبوری کے قطع نہ کیا جائے۔
جہاد کے فقہی احکام میں سے ایک حکم یہ بھی ہے کہ دشمن کی کمین گاہ میں زہریلی اشیاء کا استعمال ممنوع ہے۔
(۴)۔ اگر کسی موقع پر کفار جنگ کے دوران عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو اپنی سپر بنالیں مثلاً اگر اسلامی لشکر کی صفوں کے سامنے لا کھڑا کریں تو ایسی حالت میں جنگ ممنوع ہو جائیگی، یہاں تک کہ یہ کیفیت ختم ہو جائے۔ سوائے اسکے کہ فردی جنگ کے موقع پر مذکورہ کیفیت کی رعایت کی بنا پر شکست کھانے کا خوف ہو۔ ایسی صورت میں پوری توجہ کے ساتھ مذکورہ اشخاص کو کمترین تعداد میں قتل کرتے ہوئے جنگ کو جاری رکھا جائے گا۔

اگر مفروضہ حالات میں کوئی اسلامی سپاہی مذکورہ احکام کی رعایت نہ کرتے ہوئے بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر حملہ کردے اور ان مستثنیٰ افراد میں سے کسی کو قتل کردے تو اگر یہ قتل عمداً ہوا ہو تو اس سے قصاص لیا جائے گا نیز قتلِ عمدی کا کفارہ بھی اسے ادا کرنا ہوگا اور اگر یہ قتل غلطی سے سرزد ہوا ہو تو مقتول کافر کی دیت اس مسلمان کے مال سے لیکر مقتول کے ورثاء کو دی جائے گی۔ (جواہر: کتاب جہاد ص/۵۶۳)

(۵)۔ جنگ کو ظہر سے قبل شروع کرنا مکروہ ہے۔ یحیی بن ابی العلاء سے روایت ہے کہ امیر المومنینؑ بیان فرماتے ہیں: ''ظہر گزرنے کے بعد شب قریب ہو جاتی ہے جسکی بنا پر خونریزی کم ہو جاتی ہے اسلئے جو میدان جنگ میں آنا چاہتا ہے وہ تاریکی پھیل جانے کی بنا پر نہیں پہونچ سکے گا۔ میدان جنگ سے فرار کرنے والے کے لئے بھاگنے کے امکانات زیادہ ہیں۔'' (سابقہ حوالہ)

(۶)۔ جنگ کے آغاز کی لازمی شرط، حقائق و اصول اسلام کو بیان کرنا ہے۔ مسمع بن عبدالملک نے حضرت جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ امیر المومنینؑ نے فرمایا: ''پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے یمن بھیجا اور حکم دیا کہ اسلام کے اصول و حقائق کو بیان کئے بغیر کسی سے جنگ نہ کروں''۔ پھر آپ نے فرمایا: ''اے علیؑ! اگر تمہارے ذریعے خداوند عالم کسی کی ہدایت فرمادے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ تم ان تمام موجودات کے مالک ہو جاؤ جن پر آفتاب طلوع و غروب کرتا ہے۔''

ضروری ہے کہ قبل از جنگ، کفار کے لئے واضح کردیا جائے کہ ہمارا مقصد دنیاوی مال و منال اور حکومت و سلطنت نہیں ہے۔ لہذا اگر ایک اسلامی سپاہی دعوت سے قبل کسی ایک کافر کو قتل کردے تو اسکو مجرم

سمجھا جائے گا حتی کہ بعض فقہاء کا نظریہ یہ ہے کے اسلامی سپاہی اس کافر کے خون کا ذمہ دار ہے۔ مذکورہ بالا شرائط کے ملاحظے کے بعد اس حقیقت کو قبول کرنا بہت آسان ہے کہ پیغمبر اسلامؐ اپنے آخری ایام میں ایک وسیع وعریض سرزمین جسکی مقدار تمام یوروپ کے مساوی ہے، پر حکمرانی کررہے تھے اور اس وقت لاکھوں افراد اس سرزمین پر زندگی بسر کررہے تھے۔ دشمن کے صرف ۱۵۰ر افراد کے جانی نقصان کے بعد یہ علاقہ فتح ہوا تھا (بہ استثنائے مقتولین یہود بنی قریضہ کہ یہ لوگ اپنی سرکشی کی بنیاد پر قتل ہوئے تھے)۔ مسلمانوں کے جانی نقصان کا تخمینہ دس سال کی مدت کے دوران ایک فرد ماہانہ کے حساب سے لگایا جاسکتا ہے۔ ۱۲۰ر مسلمان اور ۱۵۰ر کافر کل ملا کر ۲۷۰ر افراد قتل ہوئے ہیں اور پورے یوروپ کے مساوی سرزمین پر حکومت اسلامی قائم ہوئی ہے اور اسکے باشندوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ (رسول اکرمؐ درمیدان جنگ: ص/۱۲)

(۷)۔ جنگوں میں نہ صرف مسلمانوں کے لئے روا نہیں ہے کہ پیمان شکنی کریں بلکہ اگر کفار کے دو گروہ برسرپیکار ہوں اور پھر صلح اور آپس میں عہد وپیمان کرلیں، اس کے بعد ان دونوں گروہوں میں سے کوئی اپنے دشمن کے خلاف مسلمانوں کے ساتھ عہد وپیمان کرنا چاہے تو یہ پیمان اسلام کی نظر میں ممنوع ہے۔ کتاب جواہر، باب جہاد ص/ ۶۲۵ پر روایت ذکر ہوئی ہے کہ طلحہ بن زید حضرت امام صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں: ''کفار حربی میں سے دو گروہوں نے باہم جنگ کی اور پھر صلح کرلی۔ پھر ان دونوں بادشاہوں میں سے ایک نے اپنے دشمن کو دھوکا دیتے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ اس دوسرے بادشاہ سے جنگ کے سلسلے میں پیمان کرلیا۔ آیا یہ مصالحت اور پیمان جائز ہے؟'' آنحضرت نے فرمایا: ''مسلمان فریب دہی نہیں کرسکتا ہے، نہ فریب وحیلہ کا حکم دے سکتا ہے اور نہ فریب کاروں اور حیلہ گروں کا ساتھ دے سکتا ہے۔ مسلمان صرف مشرکین سے جنگ کرسکتے ہیں لیکن ان کفار کا ساتھ نہیں دے سکتے جنہوں نے باہم جنگ نہ کرنے کا پیمان کرلیا ہو۔''

ترجمہ: عباس اصغر شبریز

علیؑ اور نہج البلاغہ

جس دن ہم نے نہج البلاغہ کا ادراک کرلیا اور تمام تعصّبات
وجانبداریوں سے مبرا ہوتے ہوئے اسکی کنہ حقیقت تک
پہنچ گئے اس دن ہم تمام سماجی، اخلاقی، معاشی اور فلسفیانہ
مکاتب فکر سے بے نیاز ہوجائیں گے۔

نہج البلاغہ : کتاب حق و حقیقت

حقیقت تو یہ ہے کہ ان چند جملوں کے ذریعہ نہج البلاغہ کی شناخت حاصل نہیں کی جاسکتی کیونکہ اگر ارباب علم وفلسفہ گزشتہ تاریخی حقائق کے سلسلے میں نہج البلاغہ سے استفادہ کرلیں تب بھی ان کیلئے مستقبل تو مجہول ہی ہے جبکہ نہج البلاغہ فقط ماضی وحال ہی سے مربوط نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو آئندہ سے بھی مربوط ہے کیونکہ نہج البلاغہ میں انسان وکائنات کے بارے میں جاودانہ طور پر مبسوط بحث کی گئی ہے۔ بشر وکائنات کے حوالے سے جن اصول وقوانین کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ کسی ایک زبان ومکان کو پیش نظر رکھ کر وضع نہیں کئے گئے ہیں کہ کسی ایک محدود زمانے میں مقید ہوکر رہ جائیں۔ زمانے تبدیل ہوتے رہتے ہیں

اور ہر زمانے کے افراد اپنے فہم وادراک کے مطابق اس آفاقی کتاب سے استفادہ و بہرہ برداری کرتے رہتے ہیں۔

ایسی کونسی کتاب ہے جس میں نہج البلاغہ کی طرح حیات و رموز حیات کے متعلق اسقدر عمیق اور جامع بحث کی گئی ہو اور زندگی کے دونوں پہلوؤں اور اسکی حقیقت کو بالتفصیل واضح کیا گیا ہو؟

آیا ممکن ہے کہ نہج البلاغہ کے علاوہ کسی اور کتاب میں مفہوم اور رموز موت وحیات تک دسترسی پیدا کی جا سکے؟

کیا ممکن ہے کہ بشر کے محدود ذہن کے ذریعہ ساختہ شدہ، ناقص مکاتب فکر سے اقتصادیات کے ان تمام نکات اور پہلوؤں کا استخراج کر لیا جائے جو نہج البلاغہ میں موجود ہیں؟

ہر اقتصادی مکتب فکر جہاں کچھ امتیازات ومحاسن کا حامل ہوتا ہے وہیں اسمیں کچھ نقائص بھی پائے جاتے ہیں۔ ایک مکتب فکر انسان کو اقتصادیات پر قربان کر دیتا ہے جبکہ دوسرے مکتب کی نگاہ میں انسان کیلئے معاشیات کی کوئی حیثیت نہیں ہے، تیسرا مکتب، بشر کو اس حد تک آزادی کا اختیار دے دیتا ہے کہ معاشرے کی تمام اہمیت وارزش ہی ختم ہو کر رہ جاتی ہے، چوتھا مکتب آتا ہے اور اسکی ساری توجہات معاشرے پر مرکوز ہو جاتی ہیں لیکن نہج البلاغہ نے اسلام کی معتدل روش کا اتباع کرتے ہوئے سماج کے ہر طبقے کے حقوق کی محافظت کی ہے اس طرح کہ فرد ومعاشرہ، دونوں کا یکساں خیال رکھا ہے یعنی فردی آزادی اور اختیارات فقط اس حد تک قابل قبول ہیں جہاں تک سماجی زندگی میں خلل پیدا نہ ہو ورنہ معاشرتی زندگی مذکورہ صورت میں بہر حال برتری کی حامل ہے یعنی سماجی زندگی، فردی زندگی پر فوقیت رکھتی ہے۔ نہج البلاغہ نے زندگی کے معاشی شعبے میں اسلام کے اصول وقوانین اسقدر واضح طور پر بیان کئے ہیں کہ خود بخود ہر حقدار تک اسکا حق پہونچ جاتا ہے۔ سماجی نظام حیات کو اس طرح مرتب کیا ہے کہ معاشرے کے تمام افراد ایک انسانی بدن کے اعضاء کی مانند نظر آتے ہیں۔ اگر پیر میں تکلیف ہوتی ہے تو آنکھ بھی اس درد کا احساس کرتی ہے لیکن جو کام آنکھ کر سکتی ہے، ایک پیر نہیں کر سکتا اور پیر سے ایسی توقع رکھی بھی نہیں جا سکتی لہذا اسی وجہ سے معاشرہ کو فردی زندگی پر مقدم رکھا گیا ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے کسی شخصیت کا معیار فقط وفقط تقویٰ ہے۔ اسلامی معاشرے میں وہی شخص مقام و مرتبہ کا حامل ہے جو اپنی ذمہ داریوں اور وظائف کو خاطر خواہ طور پر انجام دیتا ہے۔

اسی طرح نہج البلاغہ میں ذکر شدہ حکومت وسیاست سے متعلق امور واصول معاشرے میں ممکنہ طور پر

موجود مسائل کا راہ حل بھی پیش کرتے ہیں۔ نہج البلاغہ میں حضرت علیؑ کے ذریعے مالک اشتر کیلئے صادر شدہ فرمان میں ہر اس قانون کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے جو حکومت وعوام کے رابطے کے متعلق ایک انسانی ذہن وضع کرسکتا ہے خواہ یہ قانون کسی ایک ملک ومملکت سے متعلق ہو یا عالمی برادری کو مد نظر رکھتے ہوئے بنایا گیا ہو۔ ساتھ ہی ساتھ حضرت علیؑ کے اس فرمان کا خاصہ یہ بھی ہے کہ اس فرمان میں موجودہ نکات اور پہلوؤں تک ایک عام انسان کا ذہن پہونچ بھی نہیں سکتا۔

نہج البلاغہ کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس نے مختلف النوع مضامین ومطالب کو اتنے دلکش اسلوب میں بیان کیا ہے کہ گویا یہ کتاب ایک مسلسل مضمون پر مشتمل ہے۔ جہاں ماوراء الطبیعت مسائل کا تذکرہ کیا گیا ہے، قطعاً ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ عقل وقلب ان مسائل کے ادراک میں ایک دوسرے کی مخالف جہت میں جارہے ہوں جبکہ فلسفے کی کتابوں میں جب ایک فلسفی کسی مسئلے کی تحلیل کرتا ہے تو فقط عقلی نقطۂ نظر کو مد نظر رکھتے ہوئے۔ ایک فلسفی کے لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک ہی مسئلے کی تحلیل عقل وقلب دونوں اعتبار سے کرسکے۔ یہی وجہ ہے کہ عقل فطری اور عقل عملی (اصطلاحاً جسے ادراک قلبی ووجدانی بھی کہا جاتا ہے) کو ایک دوسرے سے جدا رکھا جاتا ہے کیونکہ روح انسانی میں ان دونوں حقیقتوں کی روش مختلف ہے۔

نہج البلاغہ کی ایک خاصیت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ جس حد تک انسان وکائنات کے متعلق حقائق و واقعات اس کتاب میں ذکر کردئے گیے ہیں، ان سے بالاتر حقائق کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر جہاں زہد وتقویٰ سے متعلق گفتگو کی گئی ہے وہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملے اس شخص کی زبان سے جاری ہورہے ہیں جسکی ساری زندگی صرف اور صرف زہد وپارسائی کے درمیان ہی گزری ہے۔

اسی طرح جن مقامات پر جنگ اور مقدمات جنگ کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے وہاں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ جملے اس شخص کی زبان سے جاری ہورہے ہیں جسکی ولادت میدان جنگ میں ہوئی ہے اور نہ فقط ولادت بلکہ اس نے جنگ کے دوران ہی اس دنیا سے کوچ بھی کیا ہے۔

جہاں حضرت علیؑ نے دنیا کی بے ثباتی اور متضاد صفات کا تذکرہ کیا ہے وہاں محسوس ہوتا ہے کہ گویا علیؑ نے دنیا کی خلقت کے اولین مرحلے ہی سے بشریت کے ساتھ زندگی گزاری ہے اور دنیا کے خاتمے تک تمام

حوادث کا بذات خود مشاہدہ کیا ہے۔

مالک اشتر کو حکومت و سیاست کے اصول تعلیم فرماتے ہیں تو ایک عام انسانی ذہن خیال کرتا ہے کہ روز اول ہی سے امامؑ نے اپنی زندگی انہیں امور کو انجام دینے میں گزاری ہے۔ آج جب کہ چاروں طرف زمانہ میں تمدن و تہذیب کا دور دورہ ہے، نہج البلاغہ میں مذکورہ دستورات کے تحت معاشرے کو مکمل طور پر مہذب و متمدن بنایا جاسکتا ہے۔

جہاں لطیف تشبیہات و کنایات کا ذکر فرمایا ہے وہاں محسوس ہوتا ہے گویا آپ کی تمام عمر ادب وفنون لطیفہ کے درمیان گزری ہے۔ توحید کے ارفع و اعلی مباحث کے متعلق خطبہ ارشاد فرماتے ہیں تو تمام فلسفی گنگ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ جس طرح حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت ایسی مختلف اور متضاد صفات کی حامل ہے کہ کسی ایک فرد میں اسکا اجتماع ممکن نہیں ہے اسی طرح نہج البلاغہ بھی مختلف و متضاد فردی و اجتماعی مسائل و امور کا سمندر اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

نہج البلاغہ سے متعلق ایک غور طلب نکتہ یہ بھی ہے کہ بعض سادہ لوح حقیقت سے بے خبر یا باخبر خود غرض افراد یہ سمجھتے ہیں کہ نہج البلاغہ سید رضیؒ کی تخلیق ہے۔ ان لوگوں کے بقول اتنا ضرور ہے کہ حضرت علیؑ کی زبان سے جاری شدہ بعض الفاظ یا جملے بھی اس میں شامل ہیں۔ اس طرح کے بے بنیاد دعوے ابن خلکان سے شروع ہوئے اور دوسرے افراد نے اسکی پیروی کی ہے۔

اولاً سید رضیؒ کے ذریعے تخلیق کردہ علم و حکمت اور ادب پارے ہماری دسترس میں ہیں۔ انکا شعری دیوان بھی کافی مشہور و معروف ہے۔ اگر سید رضیؒ کو درجۂ اول کے شعراء اور ادباء میں فرض بھی کرلیا جائے تو سید رضیؒ ماہر اقتصادیات و سماجیات یا حکیم بہر حال نہیں ہیں یعنی حضرت علی علیہ السلام کے سماجی زندگی اور حکمت سے متعلق عام خطبات تک بھی سید رضیؒ کے ذہن کی رسائی نہیں ہے۔

ثانیاً موجودہ نہج البلاغہ میں موجود آنحضرتؑ کے خطبات و مکتوبات، سید رضیؒ کی ولادت سے

پہلے ہی سے دوسری کتابوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ ایسا قطعاً نہیں ہے کہ نہج البلاغہ سید رضیؒ کی تخلیق ہے بلکہ فقط تعصب، خودغرضی اور جہالت اس بے بنیاد دعوے کا سبب ہیں۔

ثالثاً کون ہے جس نے حضرت علی علیہ السلام کے زمانے سے لیکر سید رضیؒ بلکہ آج تک اس بلند و بالا فصاحت و بلاغت اور مختلف حقائق و مسائل کو اس قدر سلیس انداز سے ایک ہی اسلوب میں بیان کیا ہو؟ ماقبل و مابعد اسلام عرب میں موجود اکثر خطبات و مکتوبات تاریخ میں موجود ہیں اور سیکڑوں کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں لیکن ایسی ایک کتاب بھی مشاہدے میں نہیں آسکی ہے کہ جسکا اسلوب اور انداز بیان نہج البلاغہ کے درجے تک پہونچ سکے۔

کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ نہج البلاغہ کے مشہور و معروف خطبے ''ان الدنیا دار مجاز والاخرۃ دار قرار'' کو معاویہ بن ابوسفیان سے منسوب کیا گیا ہے۔ ''بیان اور تبیین'' میں جاحظ کے بقول معاویہ کے پاس دنیا پرستی اور حکومت پرستی کی وجہ سے اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ ان بلند و بالا مضامین و مطالب میں اپنا سر کھپا سکتا۔ اگر ''بیان اور تبیین'' کا مطالعہ کیا جائے (سید رضیؒ نے بھی عین عبارت کو نقل کیا ہے) تو خود بخود واضح ہو جائیگا کہ معاویہ جیسے شخص کیلئے محال ہے کہ ان عالی مضامین کے حامل خطبے کو اپنی زبان سے جاری کر سکے۔

رابعاً سید رضیؒ جیسی بلند شخصیت سے بعید ہے کہ کسی شخص کے کلام کو کسی دوسرے شخص سے منسوب کریں۔ بعض مخالفین اپنے تقلیدی عقائد اور اعتقادات کو ثابت کرنے کیلئے نہ فقط یہ کہ سید رضیؒ جیسے عادل شخص کو فاسق اور دروغ گو ٹھہراتے ہیں بلکہ حضرت علیؑ کے والد بزرگوار جناب ابوطالبؑ اور جناب ابوذرؓ تک کو بھی کفار کی فہرست میں شامل کر دیتے ہیں۔ ایسے افراد کیلئے سید رضیؒ کو دروغ گو قرار دینا قطعاً اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ تاریخ میں بعض حضرات کے نزدیک کسی کو دروغ گو ثابت کر دینا بھی ایک فن ہے۔

خامساً اگر نہج البلاغہ واقعی سید رضیؒ کی تخلیق اور ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے تو پھر کیوں سید رضیؒ نے اس قدر ان کلمات و جملات کو از حد اہمیت دی ہے۔ مثلاً ایک خطبے کو نقل کرنے کے بعد سید رضیؒ تحریر فرماتے ہیں:
''یہ خطبہ گزشتہ صفحات میں بھی نقل کیا جا چکا ہے لیکن روایات کے اختلاف کی بنا پر یہاں اسکو دوبارہ نقل کیا گیا ہے۔'' یا''

مذکورہ جملے، گزشتہ خطبے میں دوسرے انداز سے نقل کیے گئے تھے لیکن اختلاف کی وجہ سے یہاں دوبارہ نقل کیا جا رہا ہے۔"

نہج البلاغہ کو حضرت علی علیہ السلام سے منسوب نہ کرنے کی دو اہم وجوہات بیان کی گئی ہیں:

(۱)۔ طرفداران حضرت علی علیہ السلام آپ کی برتری ثابت کرنے کیلئے نہج البلاغہ کو بطور مثال پیش کرتے ہیں اور نتیجتاً کہتے ہیں: "اگر دوسرے افراد بھی حضرت علیؑ ہی کی طرح بلند مقامات و مناصب کے حامل تھے تو نہج البلاغہ کا کم از کم ایک تہائی یا چوتھائی حصہ ہی ان سے نقل کیا گیا ہوتا۔ دوسرے الفاظ میں علیؑ کے پاس نہج البلاغہ جیسا شاہکار ہے، دوسروں کے پاس کیا ہے؟"

(۲)۔ حضرت علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں اکثر مقامات پر گزشتہ افراد کے متعلق اپنی ناراضگی اور عدم رضایت واضح طور پر بیان کی ہے اور یہیں سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضرتؑ کے بارے میں رسول اکرمؐ کی فرمائشات کو زمانے نے فراموش کر دیا تھا۔

نہج البلاغہ حضرت علی علیہ السلام سے صادر ہوئی ہے، اس کے لئے عمدہ ترین اور بہترین دلیل یہی ہے کہ ابھی تک نہیں سنا گیا ہے بلکہ غیر ممکن ہے کہ کوئی دعوی کرے کہ نہج البلاغہ کا کوئی بھی خطبہ یا مکتوب امیر المومنینؑ سے صادر نہیں ہوا ہے کیونکہ تمام شیعہ و سنی محدثین و مورخین اس پر متفق ہیں کہ نہج البلاغہ کا کم از کم کچھ حصہ تو حتمی اور یقینی طور پر حضرت علی علیہ السلام سے صادر ہوا ہے اور اگر کوئی شخص محدثین و مورخین کے اس اتفاق کی تصدیق کر دے (اس بات سے انکار فقط اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جب اسلامی اصول و احادیث کو طاق پر اٹھا کر رکھ دیا جائے) تو اسکو لامحالہ یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ نہج البلاغہ از اول تا آخر حضرت علی علیہ السلام سے صادر ہوئی ہے کیونکہ عربی ادبیات سے ذرہ برابر آشنائی اور واقفیت رکھنے والا شخص بغیر کسی شک و تردید کے کہہ دیگا کہ نہج البلاغہ فقط ایک اسلوب اور ایک معیار پر محیط ہے اور ایک ہی شخص سے صادر ہوئی ہے۔

اگر خورشید کو بھی اپنی نور افشانی کی تصدیق کیلئے
دوسرے خود غرض افراد کی ضرورت ہوتی تو نہ جانے
کب کا اس کائنات کو الوداع کہہ چکا ہوتا اور کسی
مجہول و مبہم گوشے میں پوشیدہ ہو کر رہ گیا ہوتا۔

ترجمہ : عباس اصغر شبریز

علیؑ اور عرفان

ان كنتم تحبون اللّٰہ فا تبعونی

(اگر خدا سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو)

علیؑ کا تعلیم کردہ عرفان حقیقی

پروردگارا! اے ہر محبوب سے زیادہ محبوب تر! اے ہر نزدیک سے زیادہ نزدیک تر!

اے بھروسہ کرنے والوں کی ڈھارس! تو ان کو اندھیروں میں بھی دیکھ لیتا ہے، تو ان کے دلوں کے حالات سے واقف ہے، تو انکی وسعت بینائی کو جانتا ہے، انکا ہر راز تیرے سامنے بے پردہ ہے اور انکا دل تیرے دیدار کا مشتاق ہے۔ اگر تنہائیوں کا اندھیرا انہیں وحشت زدہ کرتا ہے تو وہ تیری یاد کی شمعیں روشن کر کے اپنے دل کو سکون پہونچا لیتے ہیں۔ اگر تکلیف و پریشانیاں ان پر حملہ کرتی ہیں تو وہ تیری پناہ لے لیتے ہیں چونکہ جانتے ہیں کہ ہر کام تیری قدرت سے ہوتا ہے اور ہر کام تیرے ازلی قوانین سے وابستہ ہے۔

علی بن ابی طالبؑ

ہر وہ شخص جس نے قرآن کے نقطۂ نظر یا احادیث کی رو سے اصول و فروع اسلام کا غیر جانبداری کیساتھ مطالعہ کیا ہے، بلا تامل تصدیق کر سکتا ہے کہ اسلام نے انسان کیلئے نہ فقط معرفت و شناخت کے تمام راستے بیان کر دیئے ہیں بلکہ اسلامی نقطۂ نظر سے تخلیق ہستی و کائنات کی اصل علت و غرض ہی معرفت و کمال ہے۔ اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ راہ تکامل و معرفت کے حوالے سے اسلام میں نقص پایا جاتا ہے تو یقیناً ایسا شخص یا تو اسلامی تعلیمات سے بے خبر ہے یا کسی ذاتی خود غرضی کی بنا پر ایسا کہہ رہا ہے۔ اسلام ایک ایسی حقیقت ہے جسمیں ذرہ برابر بھی نقص کا شائبہ نہیں پایا جاتا ہے اور یہ دعویٰ بھی ایک ایسا دعویٰ ہے کہ اسلام کے رہنماؤں نے نہ فقط اس صدی یا کسی مخصوص زمانے میں بلکہ صدر اسلام سے لیکر اب تک ہمیشہ دنیا والوں کے گوش گزار کیا ہے۔ ایسی کونسی جاودانی و آفاقی حقیقت ہے کہ بشر نے اپنے ضعیف یا قوی افکار میں اسکی پرورش کی ہو اور اسلام نے اسکی طرف اشارہ نہ کیا ہو؟

فلسفہ، سائنس، اخلاق، سماجیات، معاشیات، قیامت وغیرہ کے بارے میں جس قدر ممکن تھا اور

واقعیت سے مطابقت رکھتا تھا، اسلام نے بطور کلی بیان کر دیا ہے۔ اگر خدا شناسی کی گفتگو کی ہے تو عقل وقلب کی بلند ترین راہوں کے ذریعے شناخت کرائی ہے، فلسفہ کے متعلق انسانی عقل کو پیش نظر رکھتے ہوئے جامع ترین نکات بیان کئے ہیں، اخلاقیات کے موضوع پر بحث کی ہے تو مختصر اور پر کشش کلمات کی صورت میں اخلاقی نکات بشر کے حوالے کئے ہیں، علم کے دروازے نہ فقط ہر شخص کے لئے کھلے چھوڑ دئے ہیں بلکہ کائنات کے ظواہر وحقائق کے بارے میں جستجو کو جزء ایمان قرار دیا ہے، معاشرے کے ہمیشہ زندہ رہنے والے اصول کو اس طرح بیان کیا ہے کہ کسی مکتب فکر یا گروہ نے اس طرح بیان نہیں کیا تھا، نہ ماقبل اسلام اور نہ مابعد اسلام۔ ساتھ ہی رہتی دنیا تک اس سلسلے میں اس سے بالاتر اور بہتر طور پر ایک حرف کا اضافہ تک نہیں کیا جا سکے گا۔

اقتصادیاتی اصولوں کی اس حد تک تشریح ووضاحت کی ہے کہ کوئی اقتصادی مکتب اسکی باریکیوں اور گہرائیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا درحالیکہ اگر کوئی مکتب فکر معاشرے کے کسی ایک پہلو کو رفو کرتا ہے تو دوسرا پہلو ہزار جگہ سے پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔

اسلام نے قیامت کا منظر اس طرح سے کھینچا ہے کہ انسان، دنیوی زندگی میں مشغول ومتوجہ ہونے کے باوجود قیامت کا مجسم تصور کر لیتا ہے۔

اس بات کی ضرورت بھی نہیں ہے کہ مشرق ومغرب سے شواہد پیش کئے جائیں اور ثابت کیا جائے کہ بلند وبالا افکار کے ذریعہ حاصل شدہ انسان وکائنات کی حقیقی معرفت کا منبع اسلام ہے کیونکہ یہ بات خود ہی اظہر من الشمس ہے۔ اسلام نے ماقبل اسلام، کتب آسمانی اور بشری عقل سالم کے ذریعے حاصل ہونے والے آفاقی حقائق کی تصدیق کی ہے لیکن اسلام کے ظہور کے بعد خدا شناسی، طبیعت شناسی اور انسان شناسی کے متعلق بیان کی جانے والی ہر قسم کی حقیقت کا سرچشمہ، خواہ منظوم ہو یا منثور، فقط وفقط اسلام ہی کو سمجھا جا سکتا ہے۔

مثلاً سعدی شیرازی کے عالی مضامین کو سنکر ہر شخص اپنا سر دھنتا ہے جبکہ سعدی کی عام غزلیات اور داستانوں کو اگر مستثنیٰ کر دیا جائے تو خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ سعدی نے اپنے مضامین عالیہ کی ترتیب وتنظیم میں یا تو براہ راست قرآن یا روایات سے استفادہ کیا ہے یا ان شعراء وحکماء سے استفادہ کیا ہے جنہوں

نے اپنے مضامین و مطالب، اسلام سے اخذ کئے ہیں مثلاً متنبّی، سید رضی، مہیا دیلمی وغیرہ۔ علاوہ ازایں، مثلاً انسان کی معنوی اور روحی آزادی و ثبات کے سلسلے میں کہے جانے والے اشعار میں بہترین شعر طغرائی کا مندرجہ ذیل شعر ہے:

انما رجل الدنیا وواحدها   من لا یقول فی الدنیا علی رجل

(جو کسی کی پناہ نہ لے، تنہا مرد میدان ہے)

غلام همت آنم که زیر چرخ کبود   زهر چه رنگ تعلق پذیرد آزاد ست

ان دونوں اشعار کا مضمون سینکڑوں مرتبہ قرآن اور روایات میں ان مقامات پر بیان ہوا ہے جہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ انسان کا ملجا و ماویٰ فقط خداوند عالم ہے البتہ ہمارے بزرگوں اور رہبروں کا ہمیشہ یہ نقص رہا ہے کہ جب وہ ان مضامین و مطالب کو بیان کیا کرتے تھے، خواہ نثر میں خواہ نظم میں، تو کبھی یہ نہیں کہتے تھے کہ یہ مضمون فلاں آیت یا روایت سے ماخوذ ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا معاشرہ بھی عام طور پر عربی زبان سے آشنا نہیں تھا اور فقط کسی حد تک قرآن و روایات سے آشنائی رکھتا تھا، وہ بھی اس وجہ سے کہ مجالس وغیرہ میں خال خال ان کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ معاشرے کو اسلام میں پائے جانے والے عالی مضامین و مطالب کی نہ شناخت تھی اور نہ پہچان۔ اسی وجہ سے ہمارے شعراء و ادباء کی زبان سے جاری ہونے والے ہر کلام و مضمون کے بارے میں یہی نظریہ قائم کیا جاتا تھا کہ یہ ان کی اپنی ذہنی جدت و تخلیق ہے، لہذا ہمارا معاشرہ قرآن و روایات کے مقابلے میں ان اشعار سے زیادہ مانوس ہو گیا جبکہ اگر گزشتہ حضرات ان مضامین عالیہ کے منابع و ماخذ کا تذکرہ بھی کر دیا کرتے تو نہ فقط ان کی شان میں کوئی کمی نہ آتی بلکہ ان کے کلام کو الٰہی تائید بھی حاصل ہو جاتی۔ اسی سہو یا غلطی کی بنا پر اسلام کو دو طرح کا ضرر و نقصان برداشت کرنا پڑا ہے؛ ایک تو یہ کہ معاشرہ قرآن و روایات سے دور ہو گیا اور یہ گمان کر لیا گیا کہ شعراء و حکماء کا سارا کلام الہامی ہوتا ہے۔

دوسرے یہ کہ ان مضامین کے دلچسپ ہونے کی وجہ سے بے سروپا مضامین بھی ان کے ساتھ ہی ساتھ معاشرے میں راسخ ہو گئے ہیں۔ انسان اگر ایک مضمون کو بیان کرتے وقت اسکا ماخذ، قرآن و روایات

کو قرار دے، درحالیکہ وہ مضمون از اول، قرآن و روایات میں موجود تھا تو یہ بذات خود بزرگی روح اور عرفان سے ارتباط کی ایک علامت ہے۔

مختصر یہ کہ اسلام نے ہر اس حقیقت کو بیان کر دیا ہے جو کسی نہ کسی صورت میں کمال و تکامل انسانی میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ اس مقام پر کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے شعراء و حکما نے ایک یہ بھی اچھا کام کیا ہے کہ ان عرفانی حقائق کو مختلف دلچسپ، پر کشش اور فنی اصطلاحات کا لباس پہنا دیا ہے یا اس طرح منظوم کر دیا ہے کہ ایک عام انسان کے احساسات تیزی کے ساتھ حرکت میں آجاتے ہیں۔

عرفان حقیقی ایک ایسا مکتب ہے کہ رسول گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد علیؑ اور آپ کی اولاد نے اس پر بطور مطلق حکومت کی ہے۔

اس بحث کا عنوان عرفان حقیقی اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ نفس انسانی، معرفت خداوندی کے تمام مبادیات وعلل اور روح کے بلند اوصاف کی شناخت اور اسکے مطابق روش، اسی طرح تمام دوسرے حقائق اور حوادث ہستی وکائنات کی شناخت کو نہ فقط تجویز کرتا ہے بلکہ ضروری ولازم بھی سمجھتا ہے۔

اس عرفان حقیقی سے روح کا مثبت پہلو مراد ہے یعنی عقل واشراقات قلبی کی بنا پر جو حقائق روح پر نازل ہوتے ہیں، کسی نہ کسی صورت میں اثر انداز بھی ہوتے ہیں اور اس طرح ہر وہ حقیقت یا واقعہ جو روح کے اس مثبت دائرے سے باہر ہے اسکو عرفان حقیقی میں خیال، توہم اور تجسیم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عرفان حقیقی کے اعتبار سے عظمت خدائی اور طبیعت (Nature) قطعاً ہم سنخ نہیں ہیں، عرفان حقیقی ان تمام

اوصاف عالیہ وکمالات کو انسان کیلیے ضروری سمجھتا ہے کہ جنکو منادیان توحید نے ہم تک پہونچایا ہے، عرفان قرب خدا کیلیے انبیاء کرامؑ کے ذریعے بیان کردہ دستورات کو ضروری گردانتا ہے، عرفان حقیقی تمام انسانوں کو تمام کمالات روحی ومقامات معنوی حاصل کرنے کے قابل سمجھتا ہے، عرفان حقیقی میں مبداءِ اعلیٰ کی طرف توجہ کے وقت ہر قسم کا واسطہ جو تجسیم قلبی کی صورت میں ہو، شرک ہے خواہ یہ مجسم شدہ واسطہ پیامبر اکرمؐ کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو۔

عرفان حقیقی کا اولین وآخرین کامل نمونہ، اپنے دست مبارک سے زراعت کرنے والے، شب کی تاریکی وتنہائی میں اپنے محاسبہ نفس کے بعد بارگاہ خداوند عالم میں حاضر ہونے والے، اشتیاق دیدار وخوف و پریشانی فراق معشوق میں بے خود ہونے والے علی بن ابی طالبؑ ہیں۔ عرفان حقیقی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے جس کو رہبران ماوراء الطبیعت نے بیان کیا ہے۔ اسکے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ فقط وفقط خیالات وتخیلات کے ذریعے تسکین روح کا باعث اور عمر گزارنے کیلیے ہی قابل قبول ہوسکتا ہے اور بس۔

علیؑ کی زندگی ہمارے لئے عرفان کی حقیقت کو واضح طور پر بیان کرتی ہے۔ علی علیہ السلام کے عرفان میں خدا ستائی کے عنوان سے خود ستائی عین شرک ہے۔

ایک مشہور داستان ہے کہ امیر المومنینؑ نے باغ بقیغہ کے پانچ وسق (تقریباً ۸۴۷ کلوگرام) خرمے ایک شخص کے پاس ارسال کئے۔ اس وقت ایک دوسرا شخص بھی امامؑ کے نزدیک موجود تھا۔ اس نے امام سے کہا کہ اے علیؑ! اس شخص نے آپ سے سوال نہیں کیا تھا پھر بھی آپ یہ خرمے کیوں ارسال کر رہے ہیں؟ امیر المومنینؑ نے فرمایا: ''خدا تجھ جیسے افراد کو مومنین کے درمیان زیادہ نہ کرے۔ میں دے رہا ہوں اور تو کنجوسی اور بخل کر رہا ہے۔ اگر ان خرموں کو اسکے دست سوال دراز کرنے کے بعد دیتا تو اس وقت اپنی اس عطا کی قیمت (اس کے سوال کی صورت میں) مجھے مل چکی ہوتی کیونکہ دست سوال دراز کرنے کے بعد وہ شخص مجبوراً اپنی آبرو وعزت دیکر خرمے حاصل کرتا۔

یہ وہی عرفان حقیقی ہے کہ جو اولاد آدم کو فرد ومعاشرے سے متعلق ذمہ داریوں اور وظائف کا احساس دلاتا ہے۔ یہ وہی عرفان حقیقی ہے کہ اگر بشریت؛ فرد، معاشرے اور حکومت کے درمیان ہر انسانی جہت سے

ممکنہ روابط کی اصلاح کیلئے غور وفکر کرے تو خود بخود مجبور ہو جائیگی کہ اس عرفان کو اپنا سرنامہ عمل قرار دے۔

یہ وہی عرفان حقیقی ہے کہ ہمارے الٰہی رہنماؤں نے جسکی طرف ساری دنیا کو دعوت دی ہے۔ یہ عرفان، اسلامی شریعت کے وہ دروس ہیں جنہیں قرآن مجید ہر صبح وشام دنیا والوں کیلئے بیان کرتا رہتا ہے: ''قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّو نَ اللّٰہ فَا تَّبِعُو نِی ''(اے رسول کہہ دو! اگر خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔)

اس عرفان میں معاشرے کے افراد ایک دوسرے کے عضو کی مانند ہیں یعنی ان اعضا میں سے ہر عضو کو دوسرے عضو کے آرام وسکون کی خاطر حتی الامکان سعی وکوشش کرنا چاہیے۔ اگر کسی عضو کی تکلیف ودرد کا علاج رات میں کیا جاسکتا ہو لیکن اسکو اگلی صبح پر موقوف کر دیا جائے تو ایسی صورت میں عرفان، عرفان حقیقی نہیں ہے اور ایسا عمل انجام دینے والا شخص بھی عارف نہیں۔

عرفان حقیقی روزمرہ زندگی کے امور کی تنظیم وترتیب کو نہایت اہمیت دیتا ہے: ''مَنْ کَانَ فِی ھٰذِہٖ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْآخِرَۃِ اَعْمٰی ''یعنی جو شخص اس دنیا میں نابینا ہے وہ آخرت میں بھی نابینا رہے گا۔ اس کے علاوہ ''مَنْ لَا مَعَا شَ لَہ لَا مَعَا دَلَہ''یعنی جو شخص زندگی گزارنے کے آداب سے واقف نہ ہو اسکی آخرت بھی بخیر نہیں ہو سکتی۔

اسی حوالے سے امامؑ فرماتے ہیں: '' اللّٰہ اللّٰہ فِی اِصلَا حِ ذَاتِ البَیْنِ وَنَظْمِ اَمْرِ کُمْ '' یعنی اے میرے بیٹو! خدا سے ڈرو اور اپنے امور کو مرتب ومنظم رکھو۔ عرفان حقیقی میں کائنات سے متعلق غور وفکر اشد ضروری ہے: '' ان فِی خَلْقِ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ واخْتِلَافِ اللَّیلِ وَالنَّھارِ لَآیاتٍ لِاُ ولِی الْاَ لْبَاب الَّذِینَ یذکرونَ اللّٰہ قیاماً وَ قُعُوداً وعَلیٰ جُنُوبِھِم ویَتَفَکَّرُوْن فِی خَلقِ السَّمٰواتِ وَالَارضِ رَبَّنَا مَاخَلَقْتَ ھٰذا بَاطِلاً سُبْحَانَکَ فَقِنَا عذَابَ النَّار '' (آل عمران/۱۹۰۔۱۹۱)

(بیشک لیل ونہار کی آمد ورفت میں صاحبان عقل کیلئے قدرت خدا کی نشانیاں ہیں۔ جو لوگ اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان وزمین کی خلقت میں غور وفکر کرتے ہیں کہ خدایا تو نے یہ سب بیکار نہیں پیدا کیا ہے۔ تو پاک وبے نیاز ہے ہمیں جہنم سے محفوظ فرما!)

لہذا عرفان حقیقی ایک ایسی حالت نہیں ہے کہ بعض مواقع پر کچھ لمحوں کیلئے حاصل ہو جائے اور بقیہ عمر

ہوئی و ہوس کی پیروی کرتے ہوئے گزار دی جائے کہ جسمیں نہ ایسی زندگی کی خبر ہے جو قرب الٰہی کا وسیلہ ہو اور نہ ذمہ داریوں اور وظائف کا احساس بلکہ عرفان حقیقی قطعاً اس کے برعکس ہے۔ عرفان حقیقی میں انسان کا مرتبہ، اشرف المخلوقات تک پہونچ جاتا ہے یعنی انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کے مدنظر ہمیشہ اور ہر مقام پر زندگی کا عالی ترین ہدف رہتا ہے۔ اس کیلئے مادی اور ظاہری دنیا قرب الٰہی کی راہوں کو مسدود نہیں کرتی ہے، روح کی عظمت و برتری کے مقابل موجودات کے ظاہری اجسام کی کوئی حیثیت نہیں ہے البتہ اتنا ضرور ہے کہ یہی اجسام، باطن کے تصفیے، خودسازی اور روح کی عظمت کو فعلیت کی حد تک پہونچانے کا بہترین وسیلہ ہیں، لہذا عرفان حقیقی میں کائنات کے متعلق غور و فکر اور اسکے حقائق و موجودات سے حتی الامکان استفادے کو تکامل انسانی کے لئے اصل واساس قرار دیا گیا ہے۔

عرفان حقیقی میں محبت سے مراد وہ عبادت ہے کہ جس کیلئے خود خدا (معشوق) کی طرف سے حکم جاری ہوا ہے تاکہ روح، علائق دنیوی سے خود کو آزاد کر سکے۔ کیونکہ اس عرفان میں محبت و عشق براہ راست فقط خدا ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ ہاں، دوسرے تمایلات و علائق بھی اگر فرمان خداوندی کی پیروی کے عنوان سے انجام دئے جائیں تو انکا شمار بھی درحقیقت عشق خدا میں ہی کیا جائیگا۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص سے محبت یا دوستی کرتا ہے تو جب بھی اسے کوئی ناگوار حادثہ پیش آتا ہے، پہلا شخص دوسرے کو صبر کی تلقین کرتا ہے، تعزیت پیش کرتا ہے تاکہ اسکو تسکین قلب حاصل ہو سکے، اگر وہ مریض ہو جاتا ہے تو اسکی عیادت کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام موارد حقیقتاً محبت خدا ہی سے سرچشمہ حاصل کرتے ہیں کیونکہ روز قیامت خداوند عالم سوال کریگا کہ میں مریض تھا تو نے میری عیادت کیوں نہیں کی؟ بندہ سوال کریگا کہ خداوندا آخر تو کیسے بیمار ہوتا ہے؟ خدا فرمائیگا کہ میرا ایک بندہ مریض تھا تو اس کی عیادت کے لئے نہیں گیا۔ اسی طرح کے واقعات انبیائے کرام اور خاندان عصمت میں اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ شمار ہی نہیں کیا جا سکتا۔ روز روشن کی طرح واضح ہے کہ خداوند عالم کو قرض کی قطعاً کوئی حاجت نہیں ہے لیکن قرآن کریم فرماتا ہے: ''مَن ذَالَّذی یقرِضُ اللهَ قَرْضاً حسناً'' (کون ہے جو خدا کو قرض حسنہ دے؟)

لہذا معاشرے میں پائے جانے والے اس طرح کے جائز روابط وتعلقات عین محبت خدا ہیں اور کیونکہ عین محبت خدا ہیں لہذا عرفان حقیقی کے اصول مسلمہ میں سے بھی ہیں۔

حقیقی عرفاء اپنے خدا کے ساتھ جس محبت وعشق کا شکار ہوتے ہیں وہ قطعی طور پر عشق حقیقی ہے نہ کہ عشق مجازی۔ عشق حقیقی ومجازی کی مزید وضاحت کے لئے ضروری ہے کہ ایک مختصر تمہید بیان کی جائے۔

عرفان اور عشق حقیقی

لفظ ''عرفان'' بھی ان الفاظ میں سے ہے کہ تاریخ علم وفلسفہ ابھی تک جنکے صحیح اور حقیقی معنی پیش نہیں کرسکی ہے یعنی یہ ایک ایسا لفظ ہے کہ ہر شخص نے اس کے لئے اپنے طور پر ایک معنی فرض کر لئے ہیں۔ بہرحال لغوی اعتبار سے لفظ ''عرفان'' بھی ''معرفت'' کی مانند ایک مصدر ہے ''معرفت'' یعنی شناخت لہذا عارف یعنی وہ شخص جو حامل شناخت ہو۔

ادبی اعتبار سے عارف اور عالم کے درمیان دو طرح کا فرق پایا جاتا ہے:

(۱)۔ عارف صرف اس شخص کو کہہ سکتے ہیں جو کسی چیز کے بارے میں پہلے سے نہ جانتا ہو اور اب وہ چیز اسے معلوم ہوگئی ہو لیکن عالم میں ایسا نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کہ آدمی، عالم کہے جانے سے پہلے بھی اس چیز کو جانتا ہو۔ اسی وجہ سے خدا کو عالم کہا جاتا ہے نہ کہ عارف کیونکہ اسکے علم سے پہلے جہل کا تصور نہیں ہے۔

(۲)۔لفظ ''معرفت'' کا استعمال اکثر و بیشتر جزئیات میں کیا جاتا ہے جبکہ ''علم'' جزئیات کے ساتھ ساتھ کلیات میں بھی مستعمل ہے ۔

لیکن فلسفہ اور حکمائے متاخرین (بوعلی سینا اور ان کے بعد) کی اصطلاح میں ''عرفان'' ایک مخصوص معنی میں مختلف انداز سے استعمال ہوتا رہا ہے۔عرفان کے لئے استعمال شدہ ان تمام معانی واصطلاحات کی گنجائش اس مختصر مقالہ میں قطعاً نہیں ہے لہذا یہاں فقط عرفان کے وہی معنی بیان کئے جارہے ہیں جو کسی حد تک آپس میں قدر مشترک رکھتے ہیں اور مشہور ہیں۔

عارف :اس شخص کو کہا جاتا ہے جو تمام علائق سے انقطاع پیدا کر کے عام کتابوں میں نوشتہ شدہ راہ و روش کے ذریعے قرب خدا حاصل کر لیتا ہے اور یہ قرب تدریجاً انسان کو مقام فنا فی اللہ میں تبدیل کر دیتا ہے کہ جسکو اصطلاحاً ''ھو ھو بعینہ'' بھی کہا جاتا ہے۔عرفان کے مذکورہ معنی مختلف انداز واطوار سے ارباب عرفان کے درمیان، نظم ونثر دونوں میدانوں میں، قابل قبول اور متفق علیہ رہے ہیں۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس عرفان کے مقدمات محبت سے شروع ہوتے ہیں یا تمام دیگر موجودات کی بے ثباتی اس عرفان کا سرچشمہ ہے یا پھر روح کا مجسم ہونا یا وہم اسکا باعث بنتے ہیں؟ ان تمام سوالوں کے جوابات تفصیلی طور پر ''عرفان منفی'' میں ہی دئے جاسکتے ہیں۔

عرفان کے ایک دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ عرفان ہر اس شخص کا مخالف ہے کہ جو منکر ہے یعنی عرفان کے اس دائرے میں کسی بھی صورت میں کوئی منکر داخل نہیں ہوسکتا کیونکہ ایسا کون سا شخص ہوگا جو معرفت و شناخت سے دوری اختیار کرنا چاہیگا اور انکار کریگا لیکن عرفان کے اس معنی سے سرسری طور پر نہیں گزرا جاسکتا بلکہ یہ ایسے معنی ہیں کہ جو نہایت احتیاط اور دقت سنجیوں کا مطالبہ کرتے ہیں مبادا خیال و پندار ہائے غلط اور غیر صحیح اپنا سر اٹھالیں۔ پس لامحالہ عرفان حقیقی ہی ایسا عرفان ہے جو انسان کو کمال وتکامل کی آخری منازل تک لے جاسکتا ہے۔خود خداوند عالم انسانوں کیلئے عرفان کے معنی کو اس طرح بیان فرمارہا ہے:''قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی'' (اے پیغمبر! کہد یجئے کہ اگر تم لوگ اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو!)

وجود انسانی میں عشق کو دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ھے:

(۱) **عشق مجازی**: اس عشق کا منبع محبوب کے وہ دلنشیں اوصاف ہوتے ہیں جو انسان کے نفس کے ساتھ ہم آہنگ اور اس سے مطابقت رکھتے ہیں یعنی انسان کا نفس ان اوصاف کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔

(۲) **عشق حقیقی**: اس عشق کا منبع محبوب کے وہ کمالات ہوتے ہیں جو انسان کی روح سے مطابقت رکھتے ہیں یعنی روح انسان ان کمالات تک پہنچنا چاہتی ہے جیسے کمال علم، علم و دانش کی محبت کو عشق حقیقی کہیں گے۔ اسکے برخلاف مال و جمال جیسی چیزوں کی محبت کو عشق مجازی کہیں گے۔ عرفان حقیقی میں اساسی کردار، عشق حقیقی کا ہوتا ہے کیونکہ عرفان حقیقی میں محبوب، کامل مطلق خدا ہے کہ جس میں ذرہ برابر نقص کا شائبہ محال ہے۔ حکماء کی اصطلاح میں یہ ایسا کمال مطلق ہے جو فوق التمام ہے اور ایسا تمام ہے جو فوق الکمال ہے۔ علاوہ ازایں، عشق مجازی میں محبوب ہمیشہ فنا ہو جانے والا ہوتا ہے جبکہ عشق حقیقی میں محبوب ہمیشہ دائم و قائم اور باقی رہنے والا ہے۔

عشق مجازی میں مبتلا افراد کی نگاہ میں عشق حقیقی کی حیثیت ایک غیر مانوس اور غیر موزوں آہنگ یا نغمے کی سی ہوتی ہے جب کہ ارباب عشق حقیقی کی نظر میں عشق مجازی میں گرفتار شخص اس پرندے کے مانند ہوتا ہے کہ جسکو ایک قفس میں محصور و مقید کر دیا جائے اور ہر لمحے اس پرندے کی خواہش و کوشش یہی رہتی ہے کہ کسی طرح اس قفس سے آزاد ہو جائے درحالیکہ وہ اس بات سے غافل ہوتا ہے کہ قفس میں موجود سوراخ یا شگاف اسکو آزاد نہیں کرا سکتے۔

اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ گنہگاروں کے سامنے عشق حقیقی سے متعلق گفتگو کرنا خود اس عشق پر ایک قسم کا ظلم و ستم ہے۔

مدح توحیف است با زندانیاں　　　گویم اندر محفل روحانیاں

(اے عشق حقیقی! حیف ہے کہ میں تیرا قصیدہ گنہگاروں کے درمیان پڑھوں بلکہ اس قصیدے کا مقام تو عشق حقیقی میں ڈوبے ہوئے دل ہیں۔)

عشق مجازی اپنے موضوع کے رفتہ رفتہ متغیر ہونے کی وجہ سے خود بھی متغیر ہوتا رہتا ہے۔ بالفرض اگر

اسکو کمال حاصل ہو بھی جائے تو ایک نہ ایک دن اسے اپنے محبوب سے دل برداشتہ ہونا ہی پڑتا ہے جبکہ اس کے برخلاف عشق حقیقی اگر عقل وقلب کو مدنظر رکھتے ہوئے شروع کیا جائے تو ہمیشہ لامتناہی کمال وتکامل کی جانب بڑھتا چلا جاتا ہے۔

یہ ہے عرفان حقیقی میں عشق کا مفہوم ومعنی کہ جسکی اولین علامت معشوق ازلی وابدی کی فرمائشات و خواہشات کی انجام آوری ہے یعنی عرفان حقیقی میں ''لا حول ولاقوۃ الا باللّٰہ'' کہا جائے تو دل کی گہرائیوں سے کہا جانا چاہئے۔

دل کی گہرائیوں سے نکلنے والا جملہ ''لا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ'' انسان کو خدائی اوامرونواہی کا پیرو بنا دیتا ہے اور پھر ایک وقت وہ بھی آتا ہے کہ جب خود عاشق کا وجود اس جملے کی نشاندہی کرنے لگتا ہے یعنی جیسے ہی نماز کیلئے اللہ اکبر کہتا ہے خود کو محراب عبادت میں اپنے ہی خون میں نہلانے تک کیلئے آمادہ اور تیار کر لیتا ہے۔

عرفان حقیقی میں جملہ'' لا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ'' عارف کے مقدس دامن کو کلمہ ''میں'' سے مکمل طور پر پاک کر دیتا ہے۔ ایک عارف کیلئے ''میں ایسا کرتا ہوں'' یا ''میں نے یہ کیا'' جیسے جملے لایعنی اور لغو ہو کر رہ جاتے ہیں لیکن ان افعال کے ماسوا جو اختیاری اور اسلامی احکامات کا محور ہیں کیونکہ عارف جانتا ہے کہ

بربادفنا تا ندھی گرد خودی را ہرگز نتوان دید جمال احدی را

(یعنی جب تک اپنی خودی اور انانیت کو خود سے دور نہیں کر لو گے اس وقت تک خدائے وحدہ لاشریک کے جمال کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔)

عارف ''اپنی عقل کو زندہ رکھتا ہے اور اپنے نفس کو مردہ بنا دیتا ہے، اسکا جسم باریک ہو جاتا ہے اور اسکا بھاری بھرکم بدن ہلکا ہو جاتا ہے اور جب وہ اس ریاضت کو انجام دے لیتا ہے تو عالی ترین حقائق کا اس طرح احساس کرتا ہے جس طرح ایک باریک بال کا۔ اس کے دل میں بہترین ضوپاش نور ہدایت چمک اٹھتا ہے اور اس نور کے ذریعے راہ ہدایت کو حاصل کر لیتا ہے۔ تمام دروازے اسے سلامتی کے دروازے اور ہمیشگی کے گھر تک پہونچا دیتے ہیں اور اس کے قدم طمانیت بدن کے ساتھ امن وراحت کی منزل میں ثابت

ہوجاتے ہیں کہ وہ اپنے دل کو استعمال کرتا ہے اور اپنے رب کو راضی کر لیتا ہے۔" (۱)

"اے ابوذر! اب جبکہ ان لوگوں نے اپنی دنیا کی خاطر تم کو معاشرے سے نکال دیا ہے ایسا نہ ہو کہ تم ماسوائے حق، کسی سے انس پیدا کرو اور غیر از باطل کسی شئی سے وحشت نہ کھاؤ۔" (۲)

مناسب ہے کہ اس مبحث کا خاتمہ ان جملوں کو قرار دیا جائے جو عرفان حقیقی کا شاہکار ہیں یعنی وہ عرفانی جملے جو روز عرفہ فرزند امیر المومنین حسین بن علی علیہما السلام کی زبان مبارک سے جاری ہوئے تھے:

خدایا! تیرے ماسوا ایسا کون ہے جو تجھے ظاہر کر سکے....

خدایا! میں اپنی مالداری میں بھی فقیر ہی ہوں تو غربت میں کس طرح فقیر نہ ہوں گا اور اپنے علم کے باوجود جاہل ہوں تو جہالت میں کس طرح جاہل نہ ہوں گا۔ تیری تدبیروں کی نیرنگی اور تیرے مقدرات کی سرعت تبدیلی نے تیرے با معرفت بندوں کو روک رکھا ہے، عطا پر سکون سے اور مصیبت میں ناامید ہونے سے۔

پروردگارا! میری طرف سے وہ سب کچھ ہے جو میری ذلت و پستی کے مطابق ہے تو تیری طرف سے بھی وہ سب کچھ ہونا چاہئے جو تیرے کرم کے شایان شان ہے۔

خدایا! تو نے اپنی تعریف لفظ لطیف و رؤوف سے کی ہے اور میرے ضعف کے وجود کے پہلے سے اسکا مظاہرہ کیا ہے تو کیا اب ضعف ظاہر ہو جانے کہ بعد اسکو روک دے گا؟

پروردگارا! اگر مجھ سے نیکیوں کا ظہور ہو تو وہ تیرے کرم ہی کا نتیجہ ہے اور اگر برائیاں ظاہر ہوں تو یہ میرے اعمال کا نتیجہ ہیں اور ان پر تیری حجت تمام ہے۔ خدایا! جب تو میرا کفیل ہے تو دوسرے کے حوالے کس طرح کریگا اور جب تو میرا مددگار ہے تو میں ذلت سے کس طرح دوچار ہوں گا۔ تو میرے حال پر مہربان ہے تو مایوس اور ناکام ہونے کی کیا وجہ ہے!

اب میں اپنی فقیری ہی کو واسطہ قرار دیتا ہوں لیکن اسے کس طرح واسطہ قرار دوں جبکہ تیری بارگاہ تک

---

(۱)۔ قد احیا عقله و امات نفسه حتی دق جلیله و لطف غلیظه و برق له لامع کثیر البرق، فابان له الطریق و تدافعته الابواب الی باب السلامة و دار الاقامة و ثبتت رجلاه بطمانینة بدنه فی قرار الامن و الراح، بما استعمل قلبه و ارضی ربه. (نہج البلاغہ خطبہ/۲۲۰)

(۲)۔ یا اباذر!.... لا یؤنسک الا الحق و لا یوحشنک الا الباطل. (نہج البلاغہ)

پہونچنے کا سوال ہی نہیں۔ میں اپنے حالات کا شکوہ کس طرح کروں کہ تو خود ہی بہتر جانتا ہے۔ اپنی زبان سے کس طرح ترجمانی کروں کہ سب کچھ تو تجھ پر خود ہی روشن وواضح ہے یا کیونکر تو میری امیدوں کو ناامیدی میں تبدیل کرسکتا ہے کیونکہ وہ تیرے ہی کرم کی بارگاہ میں پیش کی گئی ہیں اور کیسے حالات کی اصلاح نہیں کریگا جبکہ انکا قیام تیری ہی ذات سے وابستہ ہے۔

خدایا! میری عظیم ترین جہالت کے باوجود تو کس قدر مہربان ہے اور میرے بدترین اعمال کے باوجود تو کس قدر رحیم وکریم ہے۔ خدایا! تو کس قدر مجھ سے قریب ہے اور میں کس قدر تجھ سے دور ہوں اور جب تو اس قدر مہربان ہے تو اب کون درمیان میں حائل ہوسکتا ہے۔

خدایا! آثار کے اختلاف اور زمانے کے تغیرات سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ تو ہر چیز اور رنگ میں اپنے کو ظاہر وواضح کرنا چاہتا ہے کہ میں کسی بھی طرح جاہل نہ رہ جاؤں اور ہر حال میں تجھے پہچان سکوں۔

خدایا! جب میری ذلت میری زبان کو بند کرنا چاہتی ہے تو تیرا کرم قوت گویائی پیدا کر دیتا ہے اور جب میرے حالات وکیفیات مجھے مایوس بنانا چاہتے ہیں تو تیرے احسانات پھر پرامید بنادیتے ہیں۔

خدایا! میں، جسکی نیکیاں بھی بدی جیسی ہیں تو اسکی برائیوں کا کیا حال ہوگا اور جسکی نگاہ کے حقائق بھی دعوے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے ہیں تو اسکے دعووں کی کیا حیثیت ہوگی!

خدایا! تیرے نافذ حکم اور تیری قہرمان مشیت نے کسی کے لئے بولنے کا موقع نہیں چھوڑا اور نہ کسی کو کسی حال پہ ثابت رہنے دیا۔

خدایا! کتنی ہی بار میں نے اطاعت کی بنا رکھی اور حالات کو مضبوط بنایا لیکن تیرے عدل وانصاف نے میرے اعتماد کو منہدم کر دیا اور فضل وکرم نے مجھے سہارا دیا۔

خدایا! تجھے معلوم ہے کہ فعل وعمل کے اعتبار سے میری اطاعت دائمی نہیں ہے تو محبت اور عزم وجزم کے اعتبار سے تو بہرحال دائمی ہے۔

ترجمہ: محمد باقر رضا

موت

علیؑ کی نگاہ میں

موت
حضرت علیؑ کی نگاہ میں

۱۔ موت سے متعلق بحث کس حد تک علم و فلسفے کا جز ہے؟

۲۔ حقیقت زندگی پر ایک نظر

۳۔ موت، عوام کی نگاہ میں

۴۔ موت سے پہلے اور موت کے بعد

۵۔ وہ تسلی جسے اپیکور ''آخری ہلچل'' کے بارے میں اپنے ہوا خواہوں کو دیتا ہے

۶۔ موت کی ہلچل اور موت کے بعد کا شور شرابہ

ترجمہ: محمد باقر رضا

موت

علیؑ کی نگاہ میں

جیسا جملہ ہر علم وفن سے اپنی سچائی کا لوہا منواتا چلا آرہا ہے بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر روز اس جملے کی سچائی کی جڑ مضبوط ہوتی چلی جارہی ہے اور آج ''جستجوئے اضداد'' کے عنوان سے ایک مسلم قانون مانا جاتا ہے۔اس بنیاد پر حقیقت موت کو سمجھنا زندگی کو سمجھنے سے وابستہ ہے۔ہاں! اجمالی طور پر کسی چیز کو سمجھنے کے لئے مدمقابل کے مفہوم کو سمجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

دوم یہ کہ کسی موضوع یا قانون کی بحث کا علوم وفلسفہ کا جز ہونا اس بات سے جڑا ہوتا ہے کہ وہ موضوع یا قانون یقینی منزل تک ثابت ہوا ہے یا اطمینانی منزل تک یا صرف احتمالی منزل تک۔ جو مفہوم، علوم یا فلسفے میں کامل درجے تک ثابت ہو جائے وہ مکمل طور پر اسکا جز سمجھا جائے گا۔اسی طرح اگر فرض واعتبار کی مدد سے کوئی چیز ثابت ہو اور کامل درجہ تک اس کا اثبات نہ پہنچ پائے تو اسی مقدار میں اسے علم وفلسفہ کا جز قرار دیا جائے گا مثلاً آج پانی کا ہائیڈروجن اور آکسیجن سے مرکب ہونا ایک مسلمہ حقیقت ہے یعنی اگر ہر حقیقت کے مسلم الثبوت ہونے کی حد سو درجہ ہو تو پانی کا مرکب ہونا بھی سو درجہ مسلّم ہے لیکن پانی کے برخلاف ''رابطۂ عدم حمیت'' ایک غیر رسمی قضیہ ہے اور کامل درجے کے مقابل اس کی رسمیت صرف پانچ درجہ ہے۔

ان دو باتوں کے واضح ہونے کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ شناخت کے اعتبار سے موت کی بحث، علوم و فلسفہ میں دو وجہ سے غیر رسمی ہے اور سو درجہ تک نہیں پہونچ پائی ہے۔

پہلی وجہ: چونکہ زندگی کی حقیقت واضح نہیں ہے اس لئے موت بھی مبہم ہو کے رہ گئی ہے۔اس جملے کی وضاحت کے لئے زندگی اور اس کی حقیقت پر ایک نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔

(۲)۔زندگی اور اس کی حقیقت

آخری صدیوں میں طاقت فرسا کوشش اور خستہ کن محنت کے بعد جو چیز انسانی علوم کے ہاتھ لگی ہے وہ یہ کہ زندگی اور اسکی حقیقت کے بارے میں دس سے زیادہ نظریے دانشمندوں کی نگاہوں اور فلسفیوں کی نظروں سے گزرے ہیں۔کہا جاسکتا ہے کہ ان میں سے ہر نظریہ ایک خاص عینک کو لگا کر پیش کیا گیا ہے۔سب جانتے ہیں کہ میکانیک (بمعنائے عام) کے قوانین میں استقامت نہ ہونے کے سبب دانشمندوں نے فیزیالوجی کے مسئلے کو بھی ایک سادہ مسئلہ قرار دیا ہے البتہ چونکہ نتیجہ گیری، فطری اسباب سے وابستہ ہے اس

لئے خاصی کامیابی پا گیا ہے مثلاً کہا جا سکتا ہے کہ خلیے CELLS) کی خاصیت، فلاں چیز ہے، مادہ کلوئیڈ COLLOID) یا وسکس مادہ VISCOUS) انفرادی حالت میں فلاں صفت اور اجتماعی حالت میں فلاں خاصیت رکھتا ہے۔ اس مقدار کی معلومات، زندگی کو کسی حد تک خیالات کی قید سے نکال دیتی ہیں لیکن انسان جس کی تلاش میں ہے وہ اہم نکتہ یہ ہے کہ کیا محض اس مقدار کی معلومات، زندگی اور اس کی حقیقت کے بارے میں ہماری علمی وفلسفی ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہیں؟

اگر اتنی ہی مقدار کافی ہے تو'' ھنری بر گسان '' جیسے افراد جو''لوب'' جیسے افراد سے نہ عدد میں کم ہیں اور نہ قدرت فکر میں، وہ حقیقت زندگی کو فلسفے کے طولانی فارمولوں کے تحت کیوں دیکھتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو خستگی کے سبب شعر گنگنانے لگتے ہیں؟ زندگی کے مواد اس کی کارکردگی اور اس کی خصوصیت کی بحث کرنا، دماغ اور اس کی کارکردگی وخواص کی بحث کے مانند ہے بلکہ سب مانتے ہیں کہ مغز کے مواد، اعصاب NURVES) اور مختلف الشکل باریک جوڑوں سے عبارت ہیں۔

اس طرح یہ بھی واضح ہے کہ حافظہ، تخیل، ارادہ اور تفکر ایک خاص مادی مرکز رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود نفسیات کو میکانیک فیزیالوجی کے قوانین کے ساتھ نہیں جوڑا جا سکتا اور اگر بالفرض مادۂ زندگی، وہی مادۂ کلوئیڈ COLLOID) یا وسکس مادہ VISCOUS) ہے تو جنسی قوت اور مختلف جذبات جیسے دوسرے معانی کی مادۂ کلوئیڈ COLLOID) یا وسکس مادہ VISCOUS) کے ذیل میں کیسے تشریح کی جا سکتی ہے؟ ہاں! حافظہ کا مرکز مغز ہے لیکن ہزاروں ضد و نقیض حوادث جو ایک مادی مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں، ان کی تفسیر، اعضاشناسی یا قوانین فیزیالوجی کے ذریعہ نہیں کی جا سکتی اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دانشمندان فیزیالوجی اس نکتہ سے غافل رہے ہیں۔ وہ لوگ بھی ماہرین نفسیات کی طرح اس حقیقت تک پہونچ گئے ہیں کہ'' زندگی کے مواد محسوسہ (مثلاً خلیے Cells) غیر مادی چیزوں کو خلق کرتے ہیں'' لیکن یہ علماء، آسودہ خاطری اور فارغ البالی کے ساتھ اس جملے کو کافی سمجھتے ہیں کہ'' زندگی کی خصوصیتیں ایسی کیفیتیں ہیں کہ جو کمیت کے ذریعہ خلق ہوتی ہیں'' زندگی کا معمہ اس وقت حل ہو گا جب یہ جملہ فلسفہ کے وسیع فارمولوں سے نکل کر باریک بینی کے ساتھ ریاضی اور فیزکس کا فارمولا بن جائے گا۔ بدقسمتی سے یہ جملہ اگر چہ فیزیالوجی کی کتابوں

میں لکھا جاتا ہے لیکن فلسفہ کا سایہ اب بھی اس کے اوپر موجود ہے اور بہر حال اگر ہم اس سخت مسئلہ کی مثال بیان کرنا چاہتے ہیں تو ایسے مناظر کے ٹکڑے ذہن میں لانے پڑیں گے جو مادی حقائق سے وابستہ ہوں مثلاً دریا اور اس کے کنارے اگے ہوئے سر سبز و شاداب درخت وغیرہ لیکن ان قابل کیست ٹکڑوں کا اجتماع ایک خوش آئند کیفیت کا مطالبہ کرتا ہے اور یہ کیفیت، کیست کی ترازو پر نہیں تل سکتی اور مادی قوانین کے ذریعہ اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کیست کے کیفیت میں تبدیل کرنے اور زندگی کے درمیان یہ فرق ہے کہ منظر بالا کی کیفیتیں ہمارے احساس سے متعلق ہیں جبکہ حقیقت زندگی احساس کے پردے پر منعکس ہونے سے قطع نظر کیفیت کے عنوان سے خود ایک خارجی حقیقت ہے یعنی ایک زندہ وجود میں جذبات واحساسات، زندہ رہنے کی اور اولاد کی تمنا جیسی کیفیتیں اور اسی طرح ایک اعلیٰ زندہ وجود یعنی انسان میں تجسم، تفکر، اختیار اور زیبائی کی شناخت جیسی کیفیتیں پائی جاتی ہیں جو کہ خارجی واقعیت پر مشتمل ہیں۔ اگر ان سب باتوں کو مدنظر رکھا جائے اور یہ مان لیا جائے کہ زندگی کے مواد ایسی حقیقتیں ہیں جو غیر قابل کیست چیزوں کو وجود بخشتی ہیں، تو علمائے بایولوجی اور خصوصاً فیزیالوجی اور زولوجی کے دانشمندوں کی اس بات کی تصدیق ہو جائیگی کہ ''بحث کی حدیں ابھی حوادث زندگی سے عبور نہیں کر پائی ہیں اور صرف محسوس واقعات کی تشریح وتوضیح میں ہی سمٹ کر رہ گئی ہیں۔'' اس کے علاوہ یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ زندگی کے عالی فلسفہ کے سلسلہ میں ہمارے علمی وفلسفی بیانات کوتاہ دامن ہیں۔

آج بیسویں صدی کے نصف دوم میں زندگی بسر کرنے کے باوجود جب ہم قدامت پسند فلسفی شعراء پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہی ملتا ہے کہ وہ ابھی زندگی کے مقدمات اولیہ ہی میں الجھے ہوئے ہیں۔ ابوالعلاء کا شعر ہے:

الذی حارت البریۃ فیہ حیوان مستحدث من جماد

(جس چیز کے بارے میں لوگ حیرت زدہ ہیں وہ ایسی زندگی ہے جو جمادات سے وجود میں آتی ہے۔)

دوسری وجہ: یہ ہے کہ اگر ہم نے زندگی کو بالفرض سمجھ بھی لیا اور اس کا کوئی بھی گوشہ ہمارے لئے تاریک نہ رہا تو گویا ہم نے موت کو بھی سمجھ لیا ہے اور گویا ریاضی کے آسان فارمولے کے تحت کہا جا چکا ہے

کہ "موت یعنی زندگی کی ضد" لیکن ہاں! اس وقت موت سے بھی نہایت اہم اور حیرت آور مسئلہ سے دوچار ہوں گے اور وہ ہے "دنیائے بعد از مرگ" البتہ اس جملہ کی وضاحت، تفصیلات کی محتاج ہے جس کا آئندہ صفحات میں ذکر کیا جائیگا۔

(۳)۔ موت : عوام کی نگاہ میں

(متضاد نظریات کا مرکز: موت)

کوئی ایسا دانشمند نہیں ہے جو موت کے بارے میں متضاد نظریات پڑھ کر موت کا منظر دیکھنے والے کی طرح وحشت اور حیرت زدہ نہ ہو اور اس کا متاثر ہونا بھی تقریباً حق بجانب ہے چونکہ کون ہے جو موت کے ہولناک منظر کے مقابل پر کیف زندگی کے تصورات سے اپنے حواس نہ کھو بیٹھے! جیسا کہ ہم نے بتایا کہ دنیا کے دانشمند جب فیزیالوجی کے قوانین کی بنیاد پر موت کی حقیقت کی تفسیر سے عاجز آجاتے ہیں تو فلسفہ کے نامحدود فارمولوں میں لگ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قدر لمبے چوڑے فارمولے بھی پر تجسس حس کی آرزوؤں کو پورا نہیں کر سکتے۔ اس لئے وہ اس معمے کو ظاہر گوئی اور شعر خوانی کے ذریعے حل کرنے لگ جاتے ہیں۔

یہ ایک عام قانون ہے کہ جب کوئی علمی و فلسفی موضوع، عقل، منطق اور حواس کی دسترس سے نکل جائے تو ہر آدمی اپنی اپنی سوچ کے اعتبار سے اس کے خدوخال کا اندازہ لگائے گا۔ ابھی بنی آدم میں سے کوئی بھی موت کے سحر آمیز جنگل سے نکل کر عام راستے سے واپس نہیں آیا ہے تاکہ جو حقائق اس کی نظروں سے گزرے ہیں انہیں عام زبان میں بیان کر سکے۔ اسی وجہ سے زندگی کو آخری منزل سمجھنے والوں کو یہ پر اسرار حقیقت ہولناک اور بدہیئت نظر آتی ہے اس کے برعکس جو لوگ حقیقت زندگی سے آشنا اور اس کے علل ونتایج کو گہری نظر سے پڑھ چکے ہیں، ان کی نظر میں موت ایک گزرگاہ ہے یا اس فصل کے کاٹنے کا وقت ہے جس کی تخم ریزی زندگی میں کی گئی تھی اور طاقت فرسا کوشش کے ساتھ جس کی دیکھ بھال کی گئی تھی۔

اس طرح کے لوگوں کے سامنے موت ایک دل پسند اور سکون بخش صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور اسی سبب پہلے گروہ کے لئے موت کے بعد کی قیام گاہ مٹی کا تاریک گھر ہے یعنی جو زندگی کو آخری منزل سمجھتے ہیں موت ان کے لئے ایک اندھے کنویں کی طرح ہے جس کی طرف آتشیں تازیانہ کے ذریعہ

انہیں ڈھکیلا گیا ہے اور اس کے برعکس دوسرے گروہ کے لئے یہی تاریک گھر ایک سجی سجائی اور آرام دہ خواب گاہ کے مانند ہے۔

یہ جملات ایسے حقائق تھے جنہیں چھوٹا بڑا ہر ایک اپنی خالص فکر اور نا آلودہ ضمیر و فطرت کے ذریعہ سمجھتا ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ کوئی اسے فلسفی و اخلاقی اصطلاحات کا لباس پہنا دیتا ہے اور کوئی شعر و سخن کے ڈھانچے میں ڈھال دیتا ہے۔

چونکہ موت کا ذکر، روح کے اندر انکساری پیدا کرتا ہے اس لئے اس شکستگی کی تلافی کے لئے مذکورہ جملوں کا شعری صورت میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ رومی کہتا ہے ۔

مرگ ھریک اے پسر ھمرنگ او ست ‏ ‏ پیش دشمن ،دشمن و بر در دولت دوست

اے کہ می ترسی زمرگ اندر فرار ‏ ‏ آن زخود ترسانی اے جان ھوش دار

روے زشت تست نے رخسار مرگ ‏ ‏ جان تو ھمچوں درخت و مرگ و برگ

گر بخارے خستہ ای خود کشتہ ای ‏ ‏ و رحریر و قزدرے خود رشتہ ای

یا جیسے کسی نے کہا ہے: اس طرح سے رہو کہ جب اس کارواں کے اجتماع میں شرکت کرنے کے لئے تمہیں بلایا جائے جو موت کی منزل پر ایک خاص حجرے میں اپنا بار اتارنے کے لئے پراسرار قلمرو کا ارادہ رکھتے ہیں تو تم اس شخص کی طرح نہ ہو جاؤ جو تازیانوں کے ساتھ موت کے اندھے کنویں میں جاتا ہے بلکہ تمہیں اس کی طرح ہونا چاہئے جو استوار قدم اور مستحکم دل کے ساتھ اپنی جاودانی قیامگاہ کی طرف جاتا ہے اور اپنی چادر وہاں بچھا کر اس کے نیچے لیٹ جاتا ہے اور پھر آنکھوں کو شیریں و دلپذیر خوابوں کے لئے بند کر لیتا ہے اور اس طرح باعظمت قیامگاہ میں آخری ملاقات کا انتظار کرتا ہے۔

(۴) موت سے پہلے اور موت کے بعد

موریس مترلینگ اور کچھ دوسرے متفکرین نے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ حقیقت موت کی تصویر کشی میں صفحوں کے صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں لیکن افسوس قارئین کو کسی بھی صفحہ پر خود حقیقت موت کے بارے میں کچھ نہ مل سکا چونکہ ان قلمکاروں نے جو بھی چیز تحریر کی ہے وہ یا تو قبل از موت سے متعلق ہے یا بعد

ازموت سے۔ اگر قبل از مرگ کو گلی، خود موت کو صحن اور بعد از مرگ کو گھر فرض کیا جائے تو یہ لوگ صحن میں آئے بغیر ہی گلی سے گھر کے اندر داخل ہو گئے ہیں۔ واقعاً عنقا کو جس نے نہیں دیکھا ہو وہ، اپنے تفکر و تخیلات کے تحت ہی اس کی تصویر کشی کرے گا۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ قبل از مرگ اور بعد از مرگ کے مسائل کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس یہ دونوں نہایت اہم موضوع ہیں اور جیسا کہ آئے گا کہ بعد از موت کے اسرار خود موت سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ متفکرین نے حقیقت موت کی تشریح کا دعویٰ تو کیا ہے لیکن اسے پورا نہیں کیا۔ موت اور زندگی پر حکومت کرنے والے کے اس مختصر جملے کی علمی و فلسفی قدر اب سمجھ میں آتی ہے:

''میں نے ایک زمانے تک حقیقت موت کے بارے میں تحقیق کی لیکن خدا کی مشیت نے اسے پنہاں رکھا ہے، موت ایک راز ہے۔'' (نہج البلاغہ: خطبہ/۱۴۹)

(۵)۔ وہ تسلی جو اپیکور نے ''آخری ہلچل'' کے بارے میں اپنے ہوا خواہوں کو دی

اپیکور اور اپیکور کے ہوا خواہ کل بھی اور آج بھی اس طرح موت کے خدوخال کو سجاتے۔ سنوارتے ہیں جیسے کوئی عورت کسی دلہن کو سجاتی ہے اور خود اس زیبائی اور آرائش سے محروم رہتی ہے۔ وہ لوگوں کو زندگی کے آخری لحات کے خوف وہراس سے آسودہ خاطر کر دیتے ہیں۔

اپیکور کہتا تھا: ''موت سے کیوں ڈرتے ہو؟ موت سے ڈرنا بچکانہ تصور ہے چونکہ جب تک احساس ہوتا ہے موت نہیں ہوتی ہے اور جب موت آتی ہے تو احساس ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے موت کی تکلیف کے بارے میں سوچنا بے کار ہے۔'' **اپیکور** نے ظاہراً اس فلسفی جملہ مین موت کے احساس تکلیف سے بچنے کیلئے راہ فرار ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے لیکن اس موقع پر اس بچے کے مانند ہو جاتا ہے جو شب تار میں اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر عورتوں کی طرح بھاگتا ہوا کچھ اشعار پڑھ رہا ہو اور اتفاقاً یہ شعر بھی پڑھ جائے

منم آن پیل دمان و منم آن شیر یله نام من بهرام گورو کنیتم بوجبله

یا اگر اور سنجیدہ ہو کر سوچیں تو ایسا لگتا ہے جیسے ایپکور مشرق یا مغرب کے ادھیڑ لوگوں کی طرح بچکانہ حرکتیں کر رہا ہو جبکہ یہ بچوں کے کھیل کو دان کی فطرت اور طبیعت سے میل نہیں کھاتے اور صرف پیری کے موسم خزاں کو روکے رکھنے کا ایک طریقہ ہے اگرچہ صرف چند دن ہی کے لئے ہو اور پھر کبھی کبھی بہر حال انکے ذہن میں حقیقت کا خیال آ ہی جاتا ہے اور وہ خود ہی شرما اور کھسیا جاتے ہیں۔ پتا نہیں کوئی ایسا انسان ہوگا یا نہیں جو موت اور بعد از مرگ کے معمے کو زندگی پر نگاہ ڈالے بغیر ایپکور کے مختصر سے جملے کے ذریعے حل کر دے لیکن اگر ایسا کوئی انسان ہوتا تو ایپکور کا جملہ فلسفی رنگ رکھنے کے بجائے تجربہ شدہ فارمولے میں تبدیل ہو چکا ہوتا اور لکھنے والوں کی تحریریں اسے کسی اور ہی رنگ ڈھنگ میں بیان کرتیں۔ ایپکور کے حالات کو تھوڑے سے غور کے ساتھ دیکھنے سے لگتا ہے جیسے ایک آسودہ خاطر فلسفی کسی باغ میں چہل قدمی کر رہا ہو اور گل و گلشن اور باغ و بہار اس کے لئے مسکرا رہے ہوں اور جب اس کے آنکھ، کان، دل و زبان اور ذہن و دماغ اپنے فریضہ کی ادائیگی میں مشغول تھے، ایسے وقت اچانک اسے مذکورہ شعر یاد آ جاتا ہے جو کہ اس شعر کی طرح ہے۔

آنچہ در چشم می رود خوابست وآنچہ در جوی می رود آبست

اور اس طرح اس نے دنیا کے پراسرار ترین معمے کو حل کر ڈالا۔ کیا کوئی عاقل ہے جو یہ کہہ سکے کہ احساس، موت کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے؟ کون باشعور انسان ہے جو کہے کہ ''حرکت اور سکون جمع ہو سکتے ہیں؟'' ایسا کون کہہ سکتا ہے کہ ہم کو اسکے اس احمقانہ جملے کے جواب میں یہ کہنے کی ضرورت پڑے کہ نہیں جناب، حرکت و سکون جمع نہیں ہو سکتے۔

لیکن چونکہ ایپکور کا نام فلسفیوں کی فہرست میں آتا ہے اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس اظہر من الشمس جملے کو اس نے بغیر کسی بڑے مقصد کے یوں ہی کہہ دیا ہوگا۔ ایپکور اور اس کے ماننے والوں کی فلسفی روش پر غور و فکر کرنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ ایپکور بھی دوسروں کی طرح موت کی دیوار کے سوراخ سے آنکھ لگا کر اس طرف کے لامحدود اور وسیع عالم کو دیکھ رہا تھا اور اسے دیکھ کر نگراں و پریشان تھا۔ (ہاں! کون شیر دل ہے جو اس طرف کا منظر دیکھ کر گھٹنے نہ ٹیک دے؟ اور کون دل گردے والا ہے جس کا دل رشتہ ہائے

زندگی کے ٹوٹ جانے کے تصور اور موت کے بعد اس کیفیت کے بدستور قائم رہنے کے خوف کے سبب نہ دھڑکنے لگے؟) دوسری طرف اس ہولناک منظر کی چارہ جوئی بھی دو راہوں میں منحصر ہے:

۱۔ عاقلانہ طریقہ جسے دنیا کے انسانوں نے مافوق طبیعت پیشواؤں (انبیا) کی پیروی کرکے انتخاب کیا ہے۔

۲۔ اس ہولناک منظر کو نظر انداز کر دینا اور جب موت کی یاد آئے اور اس کے تصور کے کانٹے ذہن میں چبھنے لگیں تو مذکورہ جملوں کی طرح کے جملوں سے تسلی دینا۔

اپیکور نے دوسری راہ کا انتخاب کیا ہے اور آنے والے ایام کے سلسلے میں فکر کرنے کو ضروری نہیں سمجھا ہے۔ اپیکور کی توضیح واضحات سے زیادہ لطف اندوز کرنے والا کچھ فلسفی مآب افراد کا یہ جملہ ہے:

''فکر مرگ کے سلسلہ میں اپنے ذہن کو کیوں پریشان کرتے ہو؟ میں تمام اسرار و رموز کو ایک مختصر سے جملے میں بیان کر دیتا ہوں: ''زندگی یعنی روح و بدن کا وصال اور موت یعنی روح و بدن کا فراق۔''

گویا اس جملے کا بھی کوئی منکر تھا اور اگر یہ مزاح آمیز جملہ موت کے معمے کو حل کرنے نہ پہنچتا تو ساری دنیا فکر مرگ میں خودکشی کر ڈالتی۔ ایسے دعووں کے لئے یہی کہنا کافی ہے کہ **مجموعی طور پر موت کی تحلیل سے پہلے حقیقت روح وزندگی کو ڈھونڈنا چاہیئے کہ جو اصطلاحات کے انبار میں دب کر رہ گئی ہے۔**

بہر حال لوگ مذاق سمجھیں یا سنجیدہ رہیں، حواس و شعور کے انجام کے سلسلے میں دو اہم مسئلوں نے انسان کے ذہن کو الجھا رکھا ہے:

۱۔ موت کا شور وغل

۲۔ موت کے بعد کی ہلچل

(۶)۔ موت کی ہلچل اور موت کے بعد کا شور شرابا

(الف)۔ **موت کا شور وغل:** جو عضو، زندگی کی نعمت سے مالا مال ہو وہ حفظ زندگی کے لئے ہر کوشش کر ڈالے گا۔ تھوڑی دیر کی جراحت و بیماری بھی زندگی کے تقاضوں کے منافی ہوتی ہے، اسی وجہ

سے جب کوئی عضو جراحت و بیماری سے نبرد آزما ہوتو ''روح'' یا ''میں'' یا ''اعصاب کا خاص ڈھانچہ'' اذیت و آزار میں مبتلا رہتے ہیں اور وہ عضو، زندگی کے مکمل ڈھانچے کے لئے رنج والم کا سبب بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کبھی تو بیمار آرزوئے مرگ کرنے لگتا ہے اور خودکشی کرنے کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب موت تمام ظاہری و باطنی اعضا سے کھیلتی ہے اور زندگی کا ایک ایک تار ٹوٹ جاتا ہے تو کوئی درد و تکلیف ہوتی ہے یا نہیں؟

ماضی اور حال کے کچھ لوگوں نے لکھا ہے:

''یہ ٹھیک ہے کہ جانکنی کے وقت حرکت، سکون کے ساتھ دست بگریباں ہوتی ہے اور بے شک حرکت کے سکون میں تبدیل ہونے سے ایک تکلیف ضرور پیدا ہوتی ہوگی لیکن اس کی مدت نہایت کم اور کچھ منٹ یا کچھ گھنٹوں میں محدود ہوتی ہے۔''

میں نے اس جملہ کو اپیکور کی تحریروں میں نہیں دیکھا لیکن بیجا نہیں ہے کہ اپیکور کے جملے کی تکمیل میں اس طرح کہا جائے کہ ''یہ خوش فہمی تفکر کے فقدان کے سبب پیدا ہوتی ہے۔'' یہ سادہ لوح سمجھتا ہے کہ موت سے دست و پنجہ نرم کرنے والے کے حواس اور ادراکات کسی فلسفی یا کسی عام شخص کی طرح ہیں جو نعمتوں کی برسات میں آرام سے منٹ، گھنٹہ اور روز و ماہ کے مفہوم کا ادراک کرسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حقیقت یہ نہیں ہے چونکہ جب انسان کے حساس ادراکات اور قویٰ، زندگی کے اختتام کے سبب مختل ہوجاتے ہیں تو منٹ اور گھنٹہ، اندازہ گیری کے پیمانوں کے حدود سے خارج ہوجاتے ہیں اور ایک لامتناہی طول ان میں پیدا ہوجاتا ہے۔ ہاں! ہم آپ موت کے طوفانی منظر کو دور سے دیکھ کر سوچتے ہیں کہ دس منٹ یا ایک گھنٹے میں یہ شخص موت کی وادیوں کو پھلانگ گیا ہے۔

آج فیزیالوجی کے کچھ دانشمند جو بات کہتے ہیں وہ اس گفتگو سے بے ربط نہیں ہے:

''جانکنی کے وقت ایک خاص قسم کی جنبش و لرزش کچھ برقی جھٹکوں کے ساتھ دماغی اعصاب میں پیدا ہوتی ہے۔ اس وقت مغز میں کچھ ایسی حرکات دکھائی دیتی ہیں جو بتاتی ہیں کہ حافظہ ان حوادث کو سامنے لا رہا ہے جو انسان کی زندگی میں رونما ہوئے

ہیں۔'' گمان قوی ہے کہ حضرت علیؑ کے گہر بار جملے بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں: ''جانکنی کے وقت انسان ان حادثات و واقعات کے سلسلہ میں سوچتا ہے جو اس کی زندگی میں گزرے ہیں۔''

یفکر فیم ا فنی عمرہ وفیم اذ ھب دھر ہ (نہج البلاغہ: خطبہ/۱۰۹)

لاکھوں حوادث کا چند منٹوں میں جمع ہو جانا کسی طرح بھی معمولی اور روزمرہ اندازہ گیری کے پیمانوں سے میل نہیں کھاتا۔ یہ وہ پہلا مسئلہ تھا جس نے انسان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔

(ب)۔**موت کے بعد کی ھلچل**: کم وبیش ہر انسان کے دل میں یہ بات آتی ہے کہ کیا واقعاً یہ پر کیف وشیریں زندگی ایک دن وحشت آمیز خاموشی میں بدل جائے گی؟ اور کیا اس خاموشی کا سلسلہ لامتناہی ہوگا؟ یا اگر یہ شیریں زندگی ایک لامحدود سکوت کے بعد آتی ہے تو کیا اس زندگی کے بعد بھی کوئی جاودانی زندگی شروع ہوگی؟ ہاں!۔

یا سبو یا خم مے یا قدح بادہ کنند
یك کف خاك در این میکدہ ضایع نشود

خاموشی کے بے نہایت نہ ہونے کے باوجود کیسا شاعرانہ اور مبہوت کن منظر پیش کیا ہے؟ واقعاً سیاہ خاکدان ایک حیرت انگیز تماشہ گاہ ہے۔ تشخص اور امتیاز اس طرح محو ونابود ہو جائے گا کہ سقراط کے عادل قلب کو، چنگیز اور خونخوار نرون کی کھوپڑی کے ساتھ اور جمشید واسکندر وکیکاوس کے استخوانہائے دماغ کو ایک محنت کش لکڑیاں بیچنے والے کی طبیعت کے ساتھ ایک مشت مٹی میں پڑھا جا سکتا ہے۔ خمار آلود آنکھوں، گلگوں عارض، نازنیں بدن اور دنیا کی لذتوں سے لطف اندوز ہونے والا انسان جو لاکھوں اور کروڑوں ماتحتوں کے اوپر حکم فرما ہو، وہ کیسے سوچ سکتا ہے کہ ممکن ہے ایک دن یہی چاند سورج اور یہی ستارے کسی کی طرف متوجہ ہوئے بغیر اپنی روزمرہ نور افشانی میں مصروف ہوں لیکن میری بادامی آنکھیں، نازک سا عارض اور میری گلبدنی ایک مشت خاک میں بدل جائے یا پھر کسی مضبوط اور بہت بڑے پتھر کا جزء بن کے رہ جائے؟ خار مغیلاں کی شاخیں اس کے وجود کے اندر پھیل جائیں اور اس کے تن بدن میں بکھر